اور وہ بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو کرتے ہیں، اسی لیے ان کے کلام میں بڑا سوز و اثر ہے،
یہ مجموعہ بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعظم کشمیر و جموں کے نام سے معنون ہے، موصوف اس کار خیر پر شکریہ کے مستحق ہیں کہ
وہ محمود صاحب کے بچوں کی پرورش فرما رہے ہیں۔

حرف جنوں۔ از جناب بشیر فاروقی صاحب، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۶۸ مجلد مع گرد پوش قیمت ہے
ناشر مکتبہ اول بہادر شاہ مارکیٹ، کراچی۔

بشیر فاروقی صاحب کے پہلے مجموعۂ کلام "مینائے غزل" پر معارف میں تبصرہ کیا جا چکا ہے، یہ دوسرا مجموعۂ کلام
جو غزلوں، نظموں اور قطعات وغیرہ پر مشتمل اور نقش اول سے بہتر ہے، بڑے بڑے ناقدان فن نے انکے کلام کو سراہا ہے اور
انکی رائیں اس مجموعہ کے آخر میں انتخاب کے عنوان سے شائع کی گئی ہیں، فاروقی صاحب کے کلام میں روانی اور آمد کے ساتھ سنجیدگی
پختگی اور سوز و دردمندی بھی ہے، ان کا دامن ابتذال سے پاک ہے، شروع میں بابائے اردو ڈاکٹر عبد الحق اور
نیاز فتحپوری صاحب کے مختصر تبصرے اور خود شاعر کے قلم سے اپنے کلام کا تعارف ہے۔

شعرائے امروزۂ ایران۔ از ڈاکٹر سید رغیب حسین لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی، شائع کردہ کتابخانہ نامی ۵ - ایلجن روڈ الہ آباد۔

اس کتاب میں ایران کے ۱۲ جدید شعرائے فارسی کی شخصیت اور انکے کلام کا تعارف کرایا گیا ہے، اور انکے کلام کے
مختصر نمونے دیے گئے ہیں، تعارف اور انتخاب کلام مختصر مگر جامع ہے، شروع میں مؤلف کے قلم سے فارسی میں ایک دیباچہ اور
ایک پر معلومات مقدمہ ہے، جس میں ہخامنشی دور سے لیکر موجودہ دور تک کی زبان فارسی کی تاریخ اور اس کے
نشیب و فراز پر گفتگو کی گئی ہے،

لائق مؤلف قابل ستائش ہیں کہ اس زمانہ میں جب ہندوستان میں فارسی زبان کا ذوق روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے
انھوں نے ایران کے دور جدید کے شعراء اور انکی شاعری کو روشناس کیا، یہ کتاب فارسی شاعری سے ذوق رکھنے والوں
اور فارسی کے طلبہ کے لیے خاص طور سے مطالعہ کے لائق ہے۔

م ۔ ج

جلد ۸۶ ماہ جمادی الثانی ۱۳۸۰ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۶۰ء عدد ۶

مضامین

شذرات

نومبر کے دوسرے ہفتہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی چالیس سالہ جوبلی بڑے اہتمام سے منائی گئی، اس تقریب میں جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ نے اپنے کارناموں کو بڑی نفاست اور خوش سلیقگی کے ساتھ پیش کیا، پہلے روز کا جلسہ حکومت ہند کے وزیر تعلیم ڈاکٹر کے، ال شریمالی کی صدارت میں ہوا، اور جوبلی کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا، دوسرے دن نمایش کا افتتاح نظام حیدر آباد کے جواں سال، جواں ہمت اور ہونہار پوتے پرنس مکرم جاہ سے کرایا گیا، آخری دن کے جلسہ کی صدارت ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند نے کی، ان تمام اجلاسوں میں حکومت ہند کے متعدد وزراء، غیر ملکوں کے سفراء، بعض ریاستوں کے گورنر، پارلیمنٹ کے ارکین، دہلی کے عمائد اور جامعہ کے معزز مہمان شرکت کرتے رہے، جس سے جشن کی رونق بہت بڑھ گئی تھی۔

اس جشن میں جلسوں کے علاوہ مختلف تقریبات بھی ہوئیں، تقسیم اسناد کی تقریب دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی صدارت میں انجام پائی، ادیبوں کی ایک نشست خواجہ غلام السیدین کی صدارت میں تھی، جامعہ کے قدیم طلبہ کا بھی ایک اجتماع ہوا، ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں ملک کے بہت سے ممتاز شعراء شریک تھے، اس مشاعرہ سے زیادہ دلچسپ تمثیلی مشاعرہ تھا جس میں کمسن بچوں نے موجودہ دور کے تمام مشہور شعراء کے پڑھنے کے انداز کی ہو بہو نقل کی تھی، ایک مذہبی مذاکرہ (سمپوزیم) مولانا حفظ الرحمن کی صدارت میں ہوا، اس میں جامعہ کے اساتذہ میں مولانا عبد السلام قدوائی ندوی اور مولانا قاضی

محمد سجاد میرٹھی نے مفید مقالات پڑھے، اور خواجہ غلام السیدین، مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ، دار العلوم دیوبند، ندوۃ المصنفین اور دار المصنفین کے نمایندوں نے بھی تقریریں کیں، خواجہ غلام السیدین اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی کی تقریریں بہت اچھی تھیں، اور بڑی دلچسپی سے سنی گئیں، آخر میں مولانا حفظ الرحمن نے جامعہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم کو امید ہے کہ اسکے ہاتھوں میں سندان عشق کے ساتھ جام شریعت بھی رہیگا۔

ان سب تقریبوں کے روح رواں شیخ الجامعہ محمد مجیب صاحب تھے، جو اپنے علمی و تعلیمی کمالات کے ساتھ ایثار، اخلاص اور شرافت اخلاق کے بھی پیکر ہیں اور جامعہ کے ابتدائی دور سے ابتک اس سے وابستہ ہیں، انکے دور میں جامعہ نے بڑی ترقی کی ہے جسے دیکھ کر جامعہ کے خیر خواہوں کو دلی مسرت ہوتی ہے، ۱۹۴۷ء کے بعد جامعہ کو بڑے ناساز گار حالات سے سابقہ پڑا جس کو اس نے بڑی خوبی سے نباہا، اب یہاں غیر مسلم طلبہ اور طالبات بھی تعلیم پاتی ہیں، حکومت ہند اس کو امداد ضرور دیتی ہے لیکن اسکی بعض ڈگریوں کو تسلیم نہیں کرتی، اور دہلی یونیورسٹی کی موجودگی میں اس کا ایک مستقل یونیورسٹی بننا حکومت کی نظر میں کھٹکتا ہے، ان ناموافق حالات میں مجیب صاحب جامعہ کی کشتی کو حوادث کے تھپیڑوں سے بچا کر جس طرح لے جارہے ہیں وہ قابل تعریف ہے، اور یہ امر باعث اطمینان ہے کہ جشن کے موقع پر پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ امید دلائی ہے کہ جامعہ اپنی خصوصیات کے ساتھ برقرار رکھی جائے گی، ان کا یہ کہنا اس جشن کی بہت بڑی کامیابی ہے جس کے لیے مجیب صاحب اور ان کے رفقاء مبارکباد کے مستحق ہیں، اس موقع پر پنڈت جواہر لال نہرو نے وزارت تعلیم کی طرف سے ایک لاکھ روپئے کے عطیہ کا اعلان کیا، پرنس مکرم جاہ نے بارہ ہزار روپئے عطا کیے اور وزیر تعلیم کشمیر نے بیس ہزار روپئے دیے، اور دوسرے عطیات ملا کر ایک لاکھ اٹھاون ہزار روپئے کی رقم جامعہ کو ملی۔

دار المصنفین جامعہ کو اس چالیس سالہ جشن پر مبارکباد دیتا ہے، اور یہ مسرت کا مقام ہے کہ اب جامعہ

کی مالی عسرت اور تنگی کا دور ختم ہو گیا، ہم کو جامعہ کے مخلص کارکنوں سے توقع ہے کہ وہ اس خوشحالی اور مالی فراغت
کے دور میں بھی جامعہ کی پرانی خصوصیات کو قائم رکھیں گے، ورنہ ہندوستان میں تعلیمی اداروں کی کمی نہیں
جامعہ سے کہیں زیادہ بڑے بڑے ادارے موجود ہیں، جامعہ کی امتیازی شان اس کی خصوصیات ہیں، اس
لیے ان کو ہر حال میں قائم رکھنا ہی، مجیب صاحب نے اپنی ایک تقریر میں کہا ہے کہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ کا عربی اور
اسلامی نام رواداری کی ایک علامت بن گیا ہے" یہ اس کی سربلندی کی نشانی ہے، جس سے ہر شخص کو خوش
ہونا چاہیے، صدر جمہوریہ کی تقریر خاص طور پر ارباب جامعہ کے غور و توجہ کے لائق ہے، انھوں نے جامعہ
کی قومی خدمات کے اعتراف کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ "جامعہ کی ابتدا اسلامی نقطۂ نگاہ اور اسلامی تہذیب و
تمدن کو فروغ دینے اور موجودہ تعلیم میں اس کو صحیح جگہ دلانے کے مقصد سے ہوئی تھی، اور مذہب کے اصولوں پر
ٹھیک طور سے چلنے سے انسان اچھا شہری اور سچا محب وطن بن سکتا ہے، مذہب یا روحانی رجحان کسی انسان
کے لیے کسی ملک میں بھی فرائض کی ادائیگی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ڈالتا ہے بلکہ مذہبی تربیت اور روحانی
نقطۂ نظر نیک کام کو سرانجام دینے میں انسان کو مدد پہنچاتا ہے" ہم کو توقع ہے کہ ارباب جامعہ صدر جمہوریہ کے
ان مشاہدات کو ہمیشہ نگاہ میں رکھیں گے اور ان کی روشنی میں وہ جامعہ کے کاموں کا جائزہ لیتے رہیں گے،
تاکہ ان کا قدم اس کے اصلی مقصد سے ہٹنے نہ پائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی یادگار میں ایک عمارت آزاد بھون کے نام سے اندرپرست دہلی میں بنائی گئی ہے، اسکی رسم
افتتاح ۱۱ نومبر ۱۹۶۰ء کو صدر جمہوریہ نے پوری شان و شوکت سے ادا کی، یہ ایک بڑی خوبصورت عمارت ہے جس میں ہندوستان
کی مجلس ثقافتی تعلقات (انڈین کانسل آف کلچرل ریلیشنز) کا دفتر ہے، اس مجلس کے صدر حکومت ہند کے وزیر
جناب ہمایوں کبیر جیسے اہل علم ہیں، امید ہے کہ ان کی نگرانی میں آزاد بھون میں نہ صرف ثقافتی امور پر کام ہوتا
رہے گا، بلکہ مولانا آزاد کو جن علوم اور ثقافتی امور سے دلچسپی تھی، ان سے متعلق بھی کام انجام پائیں گے

مقالات

ہندی کے چند مسلمان شعراء

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب، صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی

"نیا دور" لکھنؤ بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۶۰ء میں "ہندی کے مسلمان شاعر" کے عنوان سے جناب سرسوتی سرن
کیف کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ یہ بڑا اہم اور دلچسپ موضوع ہے جس کی طرف فاضل مضمون نگار نے توجہ
دلائی ہے۔ اس موضوع پر گہری تحقیقات کی ضرورت ہے کیونکہ اس سلسلہ کا سارا مواد بکھرا پڑا ہے، اسی بنا پر
اس پر کام کرنا خاصا دشوار ہے۔ اس کا مواد صرف کسی ایک زبان، ایک قسم کی کتاب اور ایک ہی رسم خط
میں نہیں بلکہ مختلف زبانوں، مختلف قسم کی کتابوں اور اردو ہندی کے علاوہ اور دوسرے رسم خطوں میں
بھی ہے۔ اس صبر آزما اور توجہ طلب کام کے بغیر ہمارے بعض شعبے پوری طرح روشن نہیں ہوں گے۔ مجھے
سرسوتی سرن صاحب کے بیان سے پورا اتفاق ہے کہ ہندی کی تاریخ اس مواد کے استعمال کے بغیر ناقص و ناکمل
رہے گی۔ جب اس سلسلے کا مواد سامنے آئے گا تو ٹھیک طور پر معلوم ہوگا کہ ہندی ادب کی ترقی و ارتقاء
میں ہندوؤں کے دوش بدوش مسلمانوں کے کارنامے کتنے وقیع اور قابل توجہ ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ موضوع جتنا اہم تھا اس قدر جاذب توجہ نہ بن سکا اور مسلمانوں کے دور میں
اس موضوع کو جتنی اہمیت ملنی چاہیے تھی نہیں ملی، بعض مصنفین کی طرف سے کوتاہی بھی عمل میں آئی،
خصوصاً ایرانی فضلا نے جو کتابیں لکھیں ان میں ہندوستانی اثرات و میلانات کی طرف سے کچھ بے توجہی

ملتی ہے۔ مثلاً خان خاناں کے دربار سے علاوہ فارسی کے ہندی و سنسکرت کے جاننے کتنے ادیب اور شاعر وابستہ تھے۔ مگر "مآثر رحیمی" (تالیف ۱۰۲۳ھ / ۱۶۱۴ء)، خان مذکور پر سب سے زیادہ مفصل کتاب ہونے کے باوجود ہندی اور سنسکرت کے ادیبوں اور شاعروں کے ذکرسے خالی ہے، حالانکہ اس کتاب کی تیسری جلد میں جو ۱۶۰۰ سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے، صرف خان خاناں سے وابستہ شاعروں کا تذکرہ ہے۔

گر اس اعتراف کے ساتھ یہ حقیقت نہ بھولنا چاہیے کہ ابتدا ہی سے مسلمانوں نے ہندوستانی علوم اور یہاں کی زبانوں کا مطالعہ بڑی بے تعصبی سے کرنا شروع کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں متعدد تصانیف عمل میں آئیں جن میں ترجمے اور تلخیصات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اور ان علوم پر مستقل کتابیں بھی تھیں۔[ل] ان فضلا میں جنھوں نے ابتدائی دور میں ہندوستانی علوم سے بہت زیادہ آشنائی بہم پہنچائی البیرونی (وفات ۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء) کا نام سرفہرست ہے۔ "کتاب الہند" کے علاوہ "کتاب الصیدنہ" وغیرہ ہندوستانی اثرات سے متاثر ہونے کا زبردست ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

خالص فارسی کے شعرا بھی ہندوستانی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے دیوان میں ہندی الفاظ و فقرات کا استعمال اسی اثر کا نتیجہ ہے۔[۲] مجرد الفاظ و فقرات کا استعمال اتنا حیرت انگیز نہیں جتنا یہاں کی زبان میں شاعری کرنے کا معاملہ ہو اگر لباب الالباب محمد عوفی[۳] (تالیف ۶۱۶ھ / ۱۲۱۹ء) اور امیر خسرو دہلوی[۴] (وفات ۷۲۵ھ / ۱۳۲۴ء) کی یہ روایت مان لی جائے کہ مسعود سعد سلمان (م ۵۱۵ھ / ۱۱۲۱ء) نے عربی اور فارسی کے ساتھ ہندی میں ایک دیوان چھوڑا تو یہ مسئلہ خواہ کتنا ہی عجیب کیوں نہ معلوم ہو قطعی طور پر طے ہو جاتا ہے کہ ابتدائے عہد سے مسلمانوں نے ہندوستانی علوم اور یہاں کی زبان کی طرف خاص توجہ کی۔[۵]

[ل] فیروز تغلق (وفات ۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء) اس طرح کے بہت کام ہوئے تھے، دیکھئے "منتخب التواریخ" جلد ۲ ص ۲۴۹ وغیرہ

[۲] غزنوی دور کے شعرا کے یہاں یہ عنصر کافی موجود ہے، ملاحظہ ہو "پنجاب میں اردو" طبع سوم ص ۵۰ بعد [۳] لباب الالباب ج ۲ ص ۲۴۹

[۴] دیباچہ غرۃ الکمال ص ۲۶ میں لکھا ہے کہ میرے علاوہ کسی شاعر نے تین دیوان نہیں لکھے اور مسعود سعد سلمان کے تین دیوان تین زبانوں یعنی فارسی، عربی اور ہندی میں تھے۔ عربی دیوان بھی مفقود ہے گرچہ جستہ جستہ اشعار "حدائق السحر" اور "سبحۃ المرجان" میں پائے جاتے ہیں

[۵] محمود غزنوی کے عہد کے ہندی ترجمانوں کے لیے دیکھئے "پنجاب میں اردو" ص ۵۸

اور اگر یہ قول غلط بھی ہو تو بھی یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ابتدائے ساتویں صدی ہجری کے ایرانی مصنف کے لیے ایک ایرانی نژاد فارسی شاعر کا ہندی میں دیوان مرتب کرنا مستبعد نہیں معلوم ہوا۔ اس سے یہ بات تو بہر حال پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اس وقت مسلمان یہاں کی زبان میں تصنیف و تالیف کرتے رہے ہوں گے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی اس لسانی و تہذیبی قربت میں صوفیہ کے کارناموں کو بہت دخل ہے۔ ان کی وسیع المشربی ضرب المثل تھی۔ ان کی خانقاہ خواص سے زیادہ عوام کی زیارت گاہ تھی۔ ان کے مخاطب عوام تھے۔ ان کے دروازے سب پر یکساں کھلے تھے۔ اس طرح کی تعلیم ہندوستانی احول کے لیے بڑی جالب نظر تھی، چنانچہ جوق جوق لوگ ان کے پاس جاتے اور روحانی فیضان حاصل کرتے۔ اس کے لیے ان صوفیوں نے مقامی زبان کو ہر جگہ اپنانے کی کوشش کی۔ صوفیہ کے ملفوظات ہمارے اس قول پر شاہد ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق نے اپنے مشہور رسالے "اردو کی ابتدائی نشو و نما" میں بہت سے ہندی اقوال درج کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرات صوفیہ کو اس زبان سے بڑی دلچسپی تھی۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (وفات ۸۲۵ھ / ۱۴۲۱ء) کی طرف دیسی زبان میں ایک کتاب بنام "معراج العاشقین" مشہور ہے، ان کا حسب ذیل بیان[ل] نہایت اہم ہے۔

حاضرے عرضداشت کرد چہ سبب است	اہل محفل میں سے ایک نے دریافت کیا کہ کیا سبب ہے
کہ البتہ ذوق صوفیان در ہندوی بیشتر باشد	کہ حضرات صوفیہ کی توجہ گانے میں ہندی کی طرف
در صوت و غزل و قول آں چناں نیست	زیادہ ہوتی ہے اور غزل اور قول کی یہ صورت نہیں
فرمودند در ہر یکے خاصۂ از آں اوست	آپ نے فرمایا کہ ہر ایک (زبان) کی کچھ خصوصیات
کہ در دیگرے نیست۔ اما ہندوی بیشتر نرم	ہوتی ہیں جو دوسری زبانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً
و مردق می باشد و سخن گداختہ گفتہ می شود	ہندوی اکثر لطیف اور ستھری ہوتی ہے اور اس میں بات پگھلا کر
و آہنگ ہم بر دقت او نرم مردق می باشد کہ	کہی جا سکتی ہے، اور نغمہ بھی اس کے اعتبار سے ستھرا ہوتا ہے

[ل] دیکھئے جوامع الکلم ص ۱۷۲-۱۷۳ یہ گفتگو ۸۰۲ھ / ۱۳۹۸ء کے قریب کی ہے۔ اس عبارت میں بعض غلطیاں موجود ہیں۔

گریہ کنانند و اشارت بخرابی و عجزی و انکسار کنند، بضرورت مرد صوفی را آنجا بیشتر میلے باشد۔ اما سرود و ہنر سرود ادائے ضربات موسیقار در فارسی است و آنجا لذتی دیگر و ذوقی دیگر و عالمی دیگر است۔ معنی باشد کہ جز فارسی ادا نتواند کرد، ہمچنیں معنی باشد کہ جز بعربی موزوں نگردد۔ نازکی و لطافتے و اشارات بہ عالمی دیگر باشد کہ جز بہ ہندی نتواں گفت۔

اور اس سے گریہ پیدا ہوتا ہے جو عجز و انکسار کا ضامن ہے۔ حضرات صوفیہ کو اس بنا پر زیادہ رغبت ہوتی ہے لیکن سرود اور اس کا ہنر اور موسیقی کے ضربات کی ادائی فارسی کے لیے مخصوص ہے۔ اس میں مخصوص لذت و کیفیت ہے اور وہاں کا عالم ہی جداگانہ ہے، کچھ ایسی چیزیں جو سوائے فارسی کے اور کسی زبان میں ادا نہیں ہو سکتیں، کچھ ایسے خیالات ہیں جو عربی کے لیے مخصوص ہیں لیکن نازکی لطافت اور اشارہ ایسی باتیں ہیں جو صرف ہندی کی زبان میں ادا ہو سکتی ہیں۔

غرض حضرات صوفیہ کے کارنامے ہندوستان کی مختلف قوموں کے درمیان یگانگت کے رشتہ کے استوار کرنے میں کسی طرح نظر انداز نہیں ہو سکتے، مشکل سے کسی بزرگ کی تحریر ہندوستانی الفاظ، فقرات اور جملوں سے خالی ہوگی۔ اگر ان کے ملفوظات کا تتبع کیا جائے تو ان جستہ جستہ فقروں اور جملوں[1] سے ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ان میں سے بعضوں نے اسی زبان میں تصنیف و تالیف شروع کر دی تھی، شاعری تو اکثر بزرگوں نے کی ہے، ان میں بعض کے کارنامے اب بھی باقی ہیں، بعض کے صرف[2] نام ہم کو معلوم ہیں۔

ان اسباب کی بنا پر مسلمانوں میں ہندی زبان بہت مقبول ہوئی اور بہت سے مسلمان شاعروں

---

[1] مثلاً اس وقت میرے سامنے "لطائف اشرفی" مع ترجمہ اور خیر المجالس کے مطبوعہ نسخے ہیں۔ اول الذکر کے ص ۷، اور آخر الذکر کے ص ۹۳، ۱۳۳ (دو بار) ۱۹۱ (دو بار) پر متعدد جملے آئے ہیں۔ مثلاً ص ۱۳۳ کا جملہ یہ ہے۔

تو میرا گسائیں، تو میرا کرتار، مجھ وس تاپ نکھیں چھیڈا

[2] مثلاً رزق اللہ مشتاقی کے متعلق معلوم ہے کہ وہ ہندی میں راجن تخلص کے ساتھ اشعار کہتے تھے۔

اور ادیبوں نے اس کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا لیکن ان تمام مصنفین کے کارنامے ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ مگر یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جو کارنامے موجود ہیں وہ ان کے کارناموں کے مقابلے میں جو ابھی تک سامنے نہیں آئے، نہایت ہی کم ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ ان کارناموں کو بروئے کار لایا جائے تاکہ ہندوستان کی لسانی و ادبی و تہذیبی تاریخ کے رشتے استوار ہو سکیں۔

"نیا ادب" کے جس مضمون کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس لحاظ سے ادھورا ہے کہ ادھر چند برسوں میں جو مواد اس موضوع کے متعلق سامنے آیا ہے، اس کا احاطہ اس مضمون میں نہیں ہے۔ راقم حروف کی نظر میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جو اس مضمون کے تکملے کا کام دے سکتی ہیں۔ اس بنا پر باوجود اپنی بے مائیگی کے اس سلسلے میں چند سطریں پیش کرنا ضروری سمجھا۔

موجودہ معلومات کی بنا پر ہندی کے قدیم ترین شاعر امیر خسرو سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ابھی تک ان کی کوئی ایسی باقاعدہ تصنیف نہیں ملی ہے کہ جس کی بنا پر اس قیاس کی پوری تائید ہو سکے، ان کے جستہ جستہ اشعار و اقوال کی بنا پر یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے، لیکن بغیر گہری تحقیق کے اس سلسلے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن یہ قطعی طور پر معلوم ہے کہ آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں ملا داؤد نے ایک ہندی پریم کتھا چندائن کے نام سے لکھی جس کے کئی نسخے[1] ادھر چند سالوں میں دریافت ہو گئے ہیں، اور جس پر کئی تحقیقی مضامین[2] پروفیسر سید حسن عسکری (پٹنہ) کی توجہ سے شائع ہوئے، ان تحریرات سے پتہ چلتا ہے[3] کہ مولانا داؤد یوپی کے ڈلمئو کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے وہاں کی مقامی بولی اودھی میں ایک قدیم "لوک کہانی" کی بنیاد پر چندائن کا قصہ ۷۸۹ھ (۱۳۷۷ء) میں نظم کر کے شاہ تغلق سلطان دہلی کے وزیر جہان شاہ پسر

---

[1] میر شریف کا نسخہ ۸۰ صفحات کا، لاہور کا نسخہ ۷۰ ورق کا، کلا بھون بنارس کے چند باتصویر اجزا، بھوپال کا قدیم باتصویر اور زیادہ اوراق پر مشتمل نسخہ، معلوم ہوا ہے کہ آگرہ ہندی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کرنے کی تجویز زیر غور ہے۔

[2] کرنٹ اسٹڈیز پٹنہ اور بہار ریسرچ جرنل کے انگریزی مقالے اور رسالہ معاصر پٹنہ ۷ کا اردو مقالہ دیکھئے۔

[3] یہ تفصیل معاصر سے اخذ کی گئی ہے۔

خان جہاں مقبول کے سامنے پیش کیا، اس سلسلے کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

برس سات سے ہوئے اناسی　　تہیا یہ کبتی سرے جاسی

ساہ پھیروج دلی سرطانا　　جونا شاہ او جیر کھانا

دلمؤ نگر بسے نو رنگا　　اوپر کوٹ تھے بہے گنگا

(یعنی شاعر نے یہ قصہ ۷۷۹ھ[1] (۱۳۷۷ء) میں منظوم کیا، فیروز شاہ تغلق دہلی کا بادشاہ اور اس کا وزیر جونا شاہ تھا۔ دلمؤ شہر اس طرح بسا ہوا ہے کہ اس کے اوپر قلعہ ہے اور نیچے گنگا بہتی ہے)

جونا شاہ اپنے نامور باپ خان جہاں وزیر فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد ۷۷۰ھ[2] (۱۳۶۹ء) میں اس کا جانشین ہوا اور خان جہاں کا خطاب پایا۔ اور ۷۸۹ھ[3] (۱۳۸۷ء) تک اس عہدے پر متمکن رہا۔ ملا داؤد اس کی عدل کی اس طرح تعریف کرتے ہیں:

ہندو ترک دو ہو سم راکھیں　　ست جو ہوئے ڈھونڈھ کھنہ بھاکیں

گؤ سنگھا یک پتھنی رینگا وہیں　　ایک گھاٹ دوہوں پانی پیاویں

(یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں، جہاں کہیں سچائی ہوتی ہے، اسے ڈھونڈھ نکالتے ہیں، گئے اور شیر ببر کو ایک ہی راستے پر چلاتے اور دونوں کو ایک گھاٹ پانی پلاتے ہیں)

چند اُن کے قصے کے ہیرو اور ہیروئن (لورک اور چند) کا تعارف اس طرح کراتے ہیں:

---

[1] معاصر (۲) ص ۷۰ پر چھاپے کی غلطی سے ۹۷۹ھ چھپ گیا ہے۔ ص ۲۰ پر صحیح سنہ درج ہے [2] فرشتہ ۱: ۱۴۸ سے معلوم ہوا کہ خان جہاں کی وفات ۷۷۰ھ/۱۳۶۸ء میں ہوئی، پھر اس کا بڑا بیٹا جونا شاہ وزیر مقرر ہوا، بدایونی نے وفات کا سنہ ۷۷۲ دیا ہے (منتخب التواریخ ۲۵۰:۱)

[3] معاصر ص ۲۰ پر ہے کہ جونا شاہ فیروز کی وفات ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء تک وزارت کے عہدے پر متمکن رہا، مگر فرشتہ ۱: ۱۴۹ اور بدایونی ۲: ۲۵۲-۲۵۳ سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۷۸۹ھ میں یعنی فیروز کی وفات سے ایک سال قبل قتل ہو گیا تھا۔ فرشتہ نے فیروز کی تاریخ وفات غلطی سے ۷۹۹ھ دی ہے، مگر "وفات فیروز" سے تاریخ وفات برآمد کی ہے جو صحیح ہے۔

جات اہیر ہم لورک ناؤں　　کنور نگر ہمار پور ٹھانوں

سہدیو مہر کی چاندا دھیا　　مہر بیاہ باون سوں کیا

باون کیر نارلے آیوں　　چاندا تری مہر دی پایوں

ہو لہ جو آہ جیں بانٹھا مارا　　اشور اور روپچند ہارا

لورک ایک بہادر گوالا تھا، لڑکپن میں اس کی شادی مینا سے کر دی گئی۔ چند اُن یا چاندا راجہ سہدیو کی بیٹی تھی، اس سے لورک کو عشق ہوگیا، وہ بھی لورک پر جان سے فریفتہ تھی، دونوں بھاگ نکلے، لورک کا بھائی راستے میں ملا، اس نے بہت سمجھایا، مگر کچھ اثر نہ ہوا، چاندا کے شوہر نے راستہ روکا، لڑائی ہوئی اور وہ مارا گیا، ایک چار بانٹھا بھی مخل ہوا، اس نے بھی منہ کی کھائی، راو روپ چند اور اشور سب کو شکست ہوئی، لورک سب پر غالب آیا، اور ایک درخت کے نیچے دونوں نے آرام کیا لیکن چاندا کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ مر گئی، غمزدہ لورک اپنی غربت اور بے بسی کا رونا ان الفاظ میں روتا ہے:

ماتا پتا بندھو نہیں دھائی　　سنگ نہ ساتھی میت نہ بھائی

اور نہ بکھنڈ کوئی پاس نہ آوا　　کوئی مرت کہہ نیر چوا

کورے اٹھائے بیار سنبھاری　　آن کنھا کو کھے ہنکاری

دیئی پیت جیو گھر سنچارا　　باندھس ہین جھادی کے بارا

سپنے بہوتک میں کچھو دیکھا　　چت نہ سنبھار مرن لیکھا

(یعنی نہ میری ماں ہے نہ باپ، نہ رشتہ دار نہ دوست نہ ساتھی، اس بیابان جنگل میں کوئی پاس آنے والا نہیں، مرتے وقت نہ رونے والا ہے اور نہ آنسو بہانے والا کسے یاد کروں، کوئی سہارا دینے والا نہیں، جس سے محبت کی جس کے لیے گھر بار چھوڑا وہ بھی چل بسی، خواب میں بہت کچھ دیکھا، اب جی نہیں

نہیں سنبھلتا، موت ہی کا خیال آتا ہے)

چندائن کئی صدی تک بڑی مقبول رہی، اس کا اندازہ بدایونی کے حسب ذیل[1] بیان سے بخوبی ہو سکے گا۔

در سنہ اثنی وسبعین وسبع مائۃ (۷۷۲) خانجہان	۷۷۲ ہجری میں خانجہاں وزیر نے وفات پائی،
وزیر وفات یافت و پسرش جوناشہ بہمان خطاب	اس کا بیٹا جوناشہ اسی خطاب سے سرفراز ہوا،
مخاطب گشت و کتاب "چندائن" را کہ مثنوی	چندائن کتاب جو بطرز مثنوی ہے ہندی زبان میں
است بزبان ہندوی در بیان عشق لورک و	لورک و چندا اور عاشق و معشوق کے عشق کے
چندا نام عاشق و معشوق واقع خیلی حالت بخش	متعلق نہایت ہی کیفیت آفریں ہے، مولانا داؤد
است، مولانا داؤد بنام او نظم کردہ از غایت	نے اس کے لیے نظم کی تھی اور وہ اپنی بے پناہ شہرت
شہرت دریں دیار احتیاج بتعریف ندارد و	کی بنا پر محتاج تعارف نہیں ہے، مخدوم شیخ
مخدوم شیخ تقی الدین واعظ ربانی در دہلی	تقی الدین واعظ ربانی دہلی میں اس کتاب کی بعض
بعضی ابیات تقریبی او را بر منبر می خواند	مناسب ابیات منبر پر پڑھا کرتے تھے اور لوگوں
و مردم را از استماع آں حالت غریبہ	کو اس کے سننے سے عجیب و غریب حالت طاری
روی میداد۔ چوں بعضی افاضل آں عہد	ہوتی تھی، جب اس دور کے فاضلوں نے پوچھا
شیخ را پرسیدند کہ سبب اختیار ایں مثنوی	کہ اس مثنوی کے پسند آنے کی وجہ کیا ہے، انھوں نے
ہندوی چیست، جواب داد کہ تمام آں	فرمایا کہ وہ پورے کا پورا حقایق و معانی کا مجموعہ ہے
حقایق و معانی ذوقیست و موافق بوجدان	اور اہل شوق و عشق کے وجدان کے موافق و
اہل شوق و عشق و مطابق بتفسیر بعضی از	قرآن کی بعض آیات کے مطابق ہے، ہندوستان
آیات قرآنی و خوش آوازان ہند عاقلہا و	کے موسیقی داں اس کو خوش الحانی سے گاتے
خواتی آن صید دلہا می نمایند	اور دلوں کو متاثر کرتے ہیں۔

[1] منتخب التواریخ ۲: ۲۵۰ و فرشتہ ۱: ۴۰۹ میں ۷۷۳ھ ہے اور معاصر (۱۶) میں بغیر حوالہ ۷۷۲ھ درج ہے

اسی کے قریبی عہد کی ایک دوسری نظم "میناں ست" ہے۔ اس میں بھی لورک اور چندا ہی کا قصہ نظم کیا گیا ہے، البتہ اس میں بعض نئے افراد اور نئے موضوع شامل کر لیے ہیں۔ مصنف کا نام سادھن ہے مگر قطعی طور پر معلوم نہیں کہ وہ کس زمانے کا ہے اور اس نے چندائن سے استفادہ کیا ہے یا نہیں۔ وہ ہندو تھا یا مسلمان۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ "چندائن" سے اس کی زبان نسبتہً صاف ہے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ "میناں ست" چندائن کے بعد کی ہے۔ اس کے مختلف دریافت شدہ نسخوں میں منیر (پٹنہ) کے کتاب خانے کا نسخہ فارسی رسم الخط میں ہے۔ اس کی کتابت تو قدیم نہیں البتہ اس کا منقول عنہ سنہ ۹۱۱ھ (۱۵۰۵ء) میں لکھا گیا تھا، اس سے واضح ہے کہ "میناں ست" اس کے پہلے نظم ہوئی تھی، شری اودی شنکر شاستری کے ایک نسخہ میں سال کتابت ۱۷۰۹ سمبت (۱۶۵۳ء) درج ہے، اس سے "میناں ست" کا چندائن سے موخر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

جیسا عرض ہو چکا ہے سادھن کے مذہب کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ البتہ ایک نسخے پر جو کیتھی لپی میں ہے میاں سادھن بطور عنوان درج ہے۔ لفظ "میاں" سے خیال ہوتا ہے کہ سادھن غالباً مسلمان تھا، پروفیسر حسن عسکری صاحب کے نزدیک چند اور قرائن ایسے ہیں[1] جن کی بنا پر ان کا قیاس یہی ہے کہ شاید میاں سادھن مسلمان تھے۔ اور ان کے مسلمان ہونے کی بنا پر ہی اس موضوع میں شامل ہو سکتے ہیں،

ابتدائی اشعار کے بعد کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے:

ساتن کنور نگر کے دوتا ۔۔۔ کپٹ روپ نارو کے پوتا
تیہی رتناں مالن ہنکو رائی ۔۔۔ ست سوں مینا دیہ ڈولائی
دوت بچن جیوں مینہ پاوٗں ۔۔۔ تو ہ مالن چوندر بھر اودوں

[1] دیکھیے معاصر (۱۶) ص ۸۰ - ۸۱

مالن پان دو دت کر لیھناں ستت روپ سیو آکیں کیھناں

جو ہن موہن لیہنہ سبنھائے ٹونان ٹامن پھیر س تجائے

لیت دروپ مالن چن گئی میناں کے بار جھنہ بدھ رکھے ست سٹو کون ڈولایا

جو رکھے کرتار تاکو بار نہ بانکئی جو لاگے سنسار ساد ھن بچانو کی جینیئی

(یعنی ساتن ٹگر کے کٹو نے جس کا ظاہر و باطن یکساں نہ تھا اور جو کپٹ روپی ناروکا پرتاویا پوت) معلوم ہوتا تھا، رتناں مالن کٹنی کو بلایا اور کہا کہ اگر تو میناں کے قدم کو ڈگمگا کر مجھے اس بات کا یقین دلا دے تو میں ایک نئی زندگی پاؤں اور تجھے چوندری کا کپڑا پہناؤں، مالن نے اس کا بیڑا اٹھایا اور سب کے سامنے ست اور حق و راستی کا روپ دھارن کرتے ہوئے آگے بڑھی اور ٹونا ٹامن کے قسم کے سارے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میناں کے دروازے پر پہنچی، سادھن کہتے ہیں کہ صورت خطرناک تھی، لیکن جسے خدا راہِ حق پر رکھنا چاہے اسے کون پھیر سکتا ہے، خالق جس کا مددگار ہو اس کا بال کون بیکا کر سکتا ہو ساری دنیا اگر اس کے پیچھے پڑ جائے تو بدی کے سائے کی شناخت اسے ہو ہی جائے گی)

بعد کے چند بند ملاحظہ ہوں:

مالن جائے مندر میں بیٹھی میناں جہاں سنگھاسن بیٹھی

چھنگ پھول چوسا ڈ ہار د کینہ بھینٹ او دینہ جوہار د

ہنس کے پوچھی میناں رانی کہاں گوں کینہہ پہ دہائی

کہا دوتیں سن مالت میناں آن چھیں کس بولس بیناں

تو رپیتی دہائی موہ کنیھاں میں باجھ یں تو استھن دیہناں

(یعنی مالن مندر میں جا پہنچی جہاں میناں سنگھاسن پر براجمان تھی، اس نے چمپا کا پھول اور چار لڑی کا ہار بھینٹ دیا، دعا و سلام کہا، میناں نے ہنس کر پوچھا تھا کہاں سے آنا ہوا، تم کون ہو،

کٹنی نے کہا، اے مالتی کے پھول جیسی میناں تو کیسی انجنبی باتیں کرتی ہے، تیرے باپ نے مجھے تیری دودھ پلائی مقرر کیا تھا)

سادھن کا یہ قصہ بہت مقبول رہا ہے، ایک بنگالی شاعر دولت قاضی نے بنگلہ زبان میں کسی قدر ترمیم کے ساتھ ۱۶۲۲ء سے ۱۶۳۸ء کے درمیان نظم کیا ہے "لبل دیوار سو" میں سادھن کا نام آیا ہے، مگر موالتی میں "میناں ست کا ذکر اس طرح ہوا ہے :-

مالتی سن میناں کی بات اپنی ست ہے اپنے ہاتھ

ست میناں کو تو ہیں ساوں تھوڑا بات کے سمجھاوں

سالار جنگ میوزیم میں "میناں ست" کی دکھنی روایت موجود ہے[1]۔ اس میں لکھا ہے کہ یہ قصہ فارسی سے ترجمہ ہوا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ میناں ست کا قصہ فارسی میں بھی منتقل ہوا تھا،

"میناں ست" حال ہی میں گوالیار سے شائع ہو گئی ہے[2]، مگر ضرورت ہے کہ اس قصے کی مختلف روایتوں کو پیش نظر رکھ کر اس کا ایک عمدہ تنقیدی ایڈیشن تیار کیا جائے جس میں متن کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث شامل کی جائے۔

ان دونوں پریم کتھاؤں کے علاوہ میرے محدود علم میں کوئی ایسا صاحب تصنیف مصنف نہیں جس کا ذکر "نیا دور" کے مضمون میں نہ ہوا ہو، البتہ ایسے مصنف و شاعر ضرور مل جائیں گے جن کے جستہ جستہ اشعار مل جاتے ہیں۔ مثلاً مشہور بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی (وفات ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء) ہندی میں بھی مشق سخن کرتے تھے۔ اسی طرح شیخ بہاء الدین برناوی کے بھی اشعار مل جاتے ہیں، رزق اللہ مشتاقی (وفات ۹۸۹ھ) جو راجن تخلص کرتے تھے، دو ہندی کتابوں کے مصنف بتائے جاتے ہیں[3]، مگر ان میں

---

[1] دیکھئے وضاحتی فہرست مرتبہ نصیر الدین ہاشمی ص ۶۴ [2] تفصیل رسالہ سماج پٹنہ (۶۲) سے حاصل ہوئی ہے [3] پنجاب میں اردو ص ۴۳

[3] اخبار الاخیار ص ۲۶۷ پر ہے: "ہندی زبان میں جو رسالے لکھے مثلاً "پیمان" (ذکر) وجوت نرنجن" بہت مقبول و مشہور

کوئی کتاب دستبرد زمانہ سے نہ بچ سکی۔

بارھویں صدی ہجری کے فاضل علامہ آزاد بلگرامی نے اپنے تذکرہ "سرو آزاد" (تالیف ۱۱۶۶ھ / ۱۷۵۲ء) میں ایک باب ہندی شعراء کا قائم کیا ہے، جس کے ۵۰ صفحات میں بلگرام کے ۸ ہندی شاعروں کے حالات و اشعار محفوظ کر دیے ہیں۔

علامہ آزاد بلگرامی نے ہندی شعرائے متعلق فصل قائم کرنے اور "سرو آزاد" میں شامل کرنے کے سلسلے میں جو باتیں لکھی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کے مسلمان ہندی شاعر کو اپنا طغرائے امتیاز جانتے تھے۔ آزاد بلگرامی[1] لکھتے ہیں:

من ہیچدان بازبان عربی و فارسی و ہندی	یہ خاکسار عربی و فارسی و ہندی تینوں زبانوں
آشنایم و از ہر سہ میکدہ بقدرِ حوصلہ قدح	سے واقف ہوں اور تینوں کے شرابخانوں سے
پیمایم در عربی و فارسی عمرہا مشق سخن کردم	اپنے حوصلہ کے مطابق قدح پیمائی کرتا ہوں، عربی
و نو رسان معانی را در آغوشِ فکر پروردم۔	و فارسی میں مدتوں مشق سخن کی اور معانی کے نئے
مشق سخن ہندی ہرچند اتفاق نیفتادہ و فرصت	پودوں کو اپنے افکار کی گود میں پرورش کرتا رہا۔
تسخیر سبزان ایں قلمرو دست بہم ندارد اما	گو ہندی میں زیادہ مشق کرنے کا موقع نہیں ملا اور
سامعہ را از نوای طوطیان ہند حظی وافر است	اس قلمرو کے محبوبوں کی تسخیر کا موقع حاصل نہ ہوا لیکن
و ذائقہ را از چاشنی شکر فروشان ایں گلزمین	سامعہ طوطیان ہند کی بولیوں سے پوری طرح بہرہ مند رہا
نصیبی متکاثر۔	ہے اور ذائقہ کو اس زمین کے شکر فروشوں کی چاشنی سے
معنی آفرینان عربی و فارسی خون	عربی و فارسی کے معانی آفرینوں شاعروں نے رگ و ریشے
اندر رگ اندیشہ چکانیدہ اند و شیوۂ نازک	سے خون ٹپکایا ہے اور نازک خیالی کا طرز اعلیٰ درجہ
خیالی را بہ اعلیٰ مراتب رسانیدہ و افسوں	تک پہنچایا ہے، ہندوستان کے جادو گروں (شاعروں)

[1] ص ۳۵۱-۳۵۲

خوانان ہند ہم درین وادی پاس کمی نداوند بلکہ	نے بھی اس میدان میں سستی نہیں برتی بلکہ فن نائکا بھید
در فن نایکا بھید قدم سحر سازی پیش می	میں ساحری کی ہے، جو شخص فارسی اور ہندی دونوں
گذارند کسی کہ زبان فارسی و ہندی ہر دو	سے واقف ہوگا اور سفیدی اور سیاہی سے پوری
ورزیدہ و با سفیدی و سیاہی آشنائی کامل	واقفیت رکھتا ہوگا وہ مجھ ناچیز کے قول کی تصدیق
بہم رسانیدہ بہ تصدیق سخن فقیر می پردازد و	کرے گا، اور میرے دعوے پر مہر شہادت
سجل دعوی خاکسار را بہ مہر شہادت مزین می سازد	ثبت کرے گا۔
موزونان زبان ہندی در بلگرام فراوان	ہندی کے بہت سے شاعر بلگرام میں پیدا ہوئے
جلوہ نمودہ اند و دماغہا را بہ روائح صندل تر	ہیں اور دماغوں کو صندلِ تر کی خوشبو سے تازگی
تازگی و شگفتگی افزودہ لہذا فصل ایں	و شگفتگی بخشی ہے۔ اس لیے اس جماعت پر
جماعہ علیحدہ بتحریر رسید و شمامۂ معطری بدست	الگ فصل لکھ کر سونگھنے والوں کے لیے
بوشناسان حوالہ گردید۔	عطر خوشبو فراہم کر دی ہے۔

"سرو آزاد" کے خاتمہ پر[1] چند جملے آئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندی زبان کے متعلق آزاد بلگرامی کا نقطۂ نظر کس قدر قابل توجہ ہے۔

ختم کتاب بر نظم ہندی دست بہم	کتاب ("سرو آزاد") ہندی نظم پر ختم ہوئی ہے،
دادہ، چہ مضایقہ، بعض الفاظ ہندی	اس میں کوئی مضایقہ نہیں ہے، کیونکہ بعض ہندی
جزو فرقان عظیم است و جواہر سلک کلام	الفاظ فرقان عظیم کا جزو اور کلام قدیم کی سلک کے
قدیم، شیخ جلال الدین سیوطیؒ در تفسیر درِ منثور	جواہر ہیں، شیخ جلال الدین سیوطیؒ تفسیر درِ منثور
میگوید تحت قولہ تعالیٰ "طوبیٰ لہم و حسن مآب"	میں آیہ قرآنی "طوبیٰ لہم و حسن مآب" کے ذیل میں
اخرج ابن جریر و ابو الشیخ عن سعید بن مسجوح	لکھتے ہیں: ابن جریر اور ابو الشیخ نے سعید بن مسجوح

[1] ص ۴۰۶ [2] جلد ۴ ص ۵۹ (طبع مصر)

قال طوبیٰ اسم الجنة بالهندیة، و نیز شیخ جلال الدین[1]
سیوطی در تفسیر آیۂ کریمہ و سندس خضر، از
شیدلہ صاحب "کتاب برہان" نقل میکند
السندس رقیق الدیباج بالهندیة" و نیز شیخ
جلال الدین سیوطی می فرماید اخرج ابو الشیخ
عن جعفر بن محمد عن ابیہ رضی اللہ عنہما فی قولہ
تعالیٰ "یا ارض ابلعی ماءک" اشربی[2] (۱۱)
بلغة الهند، علماء فصاحت اتفاق
دارند کہ ایں آیہ افصح آیات قرآنی است
و ابدع، بینات آسمانی، و وقوع لفظ
ہندی در کلام معجز نظام خصوصاً درین
آیہ لبند پایہ از عجائب است۔

کی روایت سے کیا ہے کہ "طوبیٰ" ہندی میں جنت
کا نام ہے، نیز شیخ جلال الدین سیوطی آیۂ کریمہ
و سندس خضر کی تفسیر میں شیدلہ (صاحب کتاب برہان)
سے نقل کرتے ہیں کہ سندس ہندی میں رقیق دیبا
کا نام ہے، نیز شیخ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں
ابو الشیخ جعفر بن محمد اور ان کے باپ سے اس آیۂ
قرآنی "یا ارض ابلعی ماءک" کے ضمن میں روایت
کرتے ہیں کہ یا ارض ابلعی ماءک ہندی زبان میں
اشربی ہیں، علمائے فصاحت کا اتفاق ہے کہ یہ آیت
قرآن مجید کی فصیح ترین آیت اور دلائل آسمانی کی
بدیع ترین دلیل ہے، معجز نظام کلام (قرآن) میں لفظ
ہندی کا استعمال خصوصاً اس بلند پایہ آیت میں
عجائب میں سے ہے۔

جن آٹھ شاعروں کا تذکرہ "سرو آزاد" میں شامل ہے ان میں سے کسی شاعر کا ذکر "نیا دور"[4] کے مضمون میں نہیں ہوا ہے، اس بنا پر ان کا تعارف نہایت ضروری ہے، ذیل کے سطور میں ان شاعروں کا اجمالی تذکرہ درج ہے:

(۱) شیخ شاہ محمد[5] بن شیخ معروف فرملی، بلگرام کا فرملی خاندان، اکبر کے زمانے میں بڑا مقتدر ہو گیا تھا، انھیں میں شاہ محمد بھی تھے، وہ اکبری عہد میں احصار کے حاکم مقرر ہوئے، نظم ہندی میں بڑی استعداد

[1] اتقان ص ۱۷۱ (طبع مصر) [2] در منثور ج ۳ ص ۳۳۵ [3] یہاں غلطی سے کوئی فقرہ رہ گیا ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبی ہندی زبان میں اشربی کے معنی میں آتا ہے [4] البتہ مضمون سید مبارک علی بلگرامی اکبری دور کے ہندی شاعر کے ذکر سے خالی ہے [5] سرو آزاد ص ۳۵۲-۳۵۷

بہم پہنچائی تھی، ان کا شمار اس دور کے ممتاز شعرا میں تھا، آزاد بلگرامی کے زمانے میں بھی ان کی استادانہ حیثیت مسلم تھی، جنپا ان کی محبوبہ تھی جو بعد میں ان کے حرم میں داخل ہو گئی، اس نے بھی موزوں طبیعت پائی تھی، چنانچہ اکثر دوہوں میں سوال شاہ صاحب کی طرف سے ہے اور جواب جنپا کی طرف سے دیا گیا ہے۔ ایک بار دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے یہ مصرع کہا:

دعوم جو اوٹھت ترنگ موں یہ اچرج ہم آہ

جنپا نے فی البدیہہ کہا:

ادل روپ گو کامنی مجن کر گئی شاہ

برسات کے موسم میں جگنو کو اڑتے دیکھ کر شاہ صاحب نے کہا:

سیام رین میں کیتھ اوڑیں چمکن کوٹ دس

جنپا نے جواب میں کہا:

من منتھ باری دیٹھ بن پیہ تیہ کھوجت بھرے

ایک بار شاہ صاحب سفر سے واپس آئے، جنپا کو آبدیدہ دیکھ کر فرمایا:

کم ہدگ ڈبری سنار ہم آیو بجا یو نہیں

جنپا نے کہا:

لینھیں نین پکھار، لین ہتی تو درس بن

شاہ محمد آخر عمر میں افیون کے عادی ہو گئے تھے، ایک روز حسب ذیل دوہا لکھ کر محل سرائے جنپا کے پاس افیون کے لیے بھیجا:

جل تھنھن بیراگ، ب ہاری باہن سوئے ۔۔۔ جنپا دی پر ہٹائے یہ جوری تہاری ہوئے

جنپا نے افیون کے ساتھ یہ جواب بھی بھیجا:

روپ گنواؤں جگ ہنسن تیجی کام کی کھاد — ہوں تہ ہیو نچوں ساہ یہ کہاں بساہی پائی

شیخ شاہ محمد آخر عمر میں قنوج میں سکونت پذیر ہوئے اور وہیں وفات پائی، ان کے منظومات کے چند نسخے مولف "سرو آزاد" کے زمانے میں متداول تھے، چنانچہ مولف نے نو دوہے نقل کیے ہیں، ان میں سے دو حسب ذیل ہیں:

بہپ نراین چہر نس مانگ نک گج راہ — بدن چند دن دکھوت ام کر بھبو لوشاہ

پریتم نین ترنگ چڑھ چھانہ جو میلت آئی — من پار اگھٹ کوپ نین ابھر دوہوں دس جائی

حسب ذیل تین دوہے چنپا کی طرف منسوب ہیں:

سا ہا رنگ دن یوں ہتے جیتون کھنچی آکاس — بھیو کھٹولن کو سمی ایک ایک نہہ پاس

تاہ نہ ساہ بسارہے پاودھا جیونت — ہم کمدن تم سر دس کر پاکرن سومت

برہ اُساس جرت اب تیہ کمت بن نا نہہ — منون سراوت تن تپت پرت جالی ود مانہہ

(۲) سید نظام الدین مدھنایک[1] سید علاء الدین کے بیٹے تھے، ہندی موسیقی میں یگانۂ روزگار سمجھے جاتے تھے، لطیفہ گوئی، نکتہ سنجی، جود وسخا میں مرتبۂ کمال رکھتے تھے۔ نظم ونثر میں بڑا ذوق پہنچایا اور ان سے متعلق استادوں سے معتبر کتابیں پڑھیں، ان کی طبیعت ہندی علوم کی طرف مائل ہوئی، اور بنارس جا کر وہاں ہندی علوم بڑی محنت اور توجہ سے حاصل کیے۔ سنسکرت اور بھاکا میں پوری مہارت پیدا کی اور موسیقی ہندی کے فن کے محقق سمجھے جانے لگے۔ مدھنایک تخلص اسی کمال کی یادگار ہے۔ دو کتابیں لکھیں، ایک "نادچندرکا" دوسری "مدھنایک سنگار"۔ ١٠٩٩ھ (١٦٨٧ء) بلگرام میں فوت ہوئے۔ ان کی پانچ کتابیں سرو آزاد میں مندرج ہیں:

[1] سرو آزاد ص ۳۵۶ - ۳۵۹

سنگ لاگ ڈولت مگر سرسا گرن جیتون پان کو جو ترکا ہو جیتو

للت رسن وب بولت کلت — دنت اکیدہ ہسن ادہرن ہیت ہیتو

اوگت ہوت نہ سر یہ کنتی سادھیر کنت کچھ کہتا کو کتھن کہو کہ جیتو

روس ہوں سورس ال سپنت نلن جیمیں دیوس کچھ دیکھ کنھنا کانتی رتیو

(۳) دیوان سید رحمت اللہ[1] دیوان سید بھیکہ کے پوتے اور خیر اللہ کے بیٹے تھے، دادا کے بعد جاجمئو اور جیو آر کے حاکم مقرر ہوئے، کچھ دنوں بعد اپنے بڑے بھائی کے ساتھ دکن گئے، وہاں سے واپسی پر سلیم پور (اناؤ) میں سکونت اختیار کی اور وہیں ١١١٨ھ (١٧٠٦ء) میں فوت ہوئے، لاش بلگرام میں لائی گئی اور یہیں دفن کی گئی۔ سید رحمت اللہ ہندی کے مسلم الثبوت استاد تھے۔

جاجمئو کے قیام کے دوران میں چنتامن شاعر کے حسب ذیل دوہے پر جو "انیا النکار" میں تھا، تعریض کی:

ہیو ہرت ار کرت ات چنتامن چت چین — وا مرگ نینی کی لکھی واہی کیسی نین

سید رحمت اللہ کا اعتراض یہ تھا: یہ دوہا "انیا النکار" کی مثال نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ محبوبہ (نایکا) کو "مرگ نینی" کہا گیا ہے اور اسکی آنکھ کی مشابہت ہرن کی آنکھ سے ثابت ہو گئی۔

چنتامن کو اس اعتراض کا حال معلوم ہوا تو اس نے دوہے کو اس طرح تبدیل کر دیا:

وا سندری میں لکھی واہی کیسی نین

کچھ دنوں بعد چنتامن اپنے وطن کوڑہ جہان آباد سے دیوان رحمت اللہ کے پاس جاجمئو آیا اور ایک کبت جھولنا چھند میں دیوان کی مدح میں نظم کیا۔ رحمت اللہ کی ایک کتاب "پورن رس" ہے، اسکے ۲۷ دوہے "سرو آزاد" میں نقل ہوئے ہیں، تین دوہے ناظرین کی خدمت میں پیش ہیں:

کاری سٹکاری کری کہری سرس سکمار — لوٹن ہاری جگت کی لوٹن ہاری بار

سوہت بینی پیٹھ پر جھینیں پٹ کی بہائی — لوٹت ناگن کنول دل انگ پر آگ لگائی

مانگ سہاگ بھری الی بب پاٹی چھب چھائے — سیام منوں گھنسیام میں چپلا لیک لکھائے

(باقی)

[1] سرو آزاد ص ۳۵۹ - ۳۶۶

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تہوار

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے

(۳)

عید بقرعید کی طرح شب برات کوئی تہوار نہیں ہے، اس کی مذہبی حیثیت صرف اس قدر ہے کہ لیلۃ البرات ایک مقدس رات ہے، اس رات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ عبادت فرماتے تھے، مردوں کی دعائے مغفرت کے لیے قبرستان تشریف لیجاتے تھے اور دوسرے دن روزہ رکھتے تھے، دیندار مسلمانوں کا عمل بھی اسی پر ہا لیکن عام مسلمانوں میں دوسری چیزوں کی طرح شب برات میں بھی بہت سی بدعات اور رسمیات داخل ہوگئیں اور اس کی حیثیت ایک تہوار کی ہوگئی جس کو عوام وخواص سب ہی مناتے تھے، مسلمان سلاطین بھی اس کو اسی شکل میں مناتے تھے۔

سلاطین دہلی کے عہد کی شب برات سلاطین دہلی کے عہد میں شب برات جس طرح منائی جاتی، اس کا اندازہ عفیف کے اس بیان سے ہوگا جس میں اس نے فیروز شاہ تغلق کے عہد کی شب برات کا نقشہ کھینچا ہے، وہ لکھتا ہے کہ شعبان کی تیرہویں، چودھویں اور پندرھویں شب کو آتشبازی کا عجیب وغریب نظارہ ہوتا تھا، کوشک فیروزآباد میں آتش بازی چھوڑنے کے لیے چار اٹگ بنائے جاتے، ایک اٹگ بادشاہ کے لیے مخصوص ہوتا،

دوسرا اٹگ ملک نائب باربک، اور تیسرا ملک علی اور چوتھا ملک یعقوب پسر ملک محمد علی کا ہوتا، چاروں اٹگ پر طبل و دمامے بجائے جاتے اور محل میں اتنے مشعل اور چراغ روشن کیے جاتے کہ آس پاس کی فضا منور ہو جاتی، چاروں اٹگ میں کشتیاں باندھی جاتیں اور ہر کشتی میں بے شمار شعلیں روشن کیجاتی تھیں طبل بجتا رہتا تھا، اور آتشبازی کے ہر طرح کے تماشے ہوتے رہتے، اس کو دیکھنے کے لیے نہ صرف شاہزادے، خواتین اور ملوک موجود ہوتے بلکہ دور دور سے ہندو مسلمان دونوں آتے، اور اس کو دیکھ کر محظوظ ہوتے، اس موقع پر سلطان کی خدمت میں مختلف اہل حرفہ مٹی کے ہاتھی اور اونٹ بھی بنا کر پیش کرتے اور انعام پاتے [۱]

عہد مغلیہ کی شب برات عہد مغلیہ میں بھی یہ روایت قائم رہی، اس روز شاہی محل اور دوسری عمارتوں میں چراغاں کیا جاتا جس سے صحن و چمن سب منور ہو جاتے، آتش بازی کے تماشے دکھلائے جاتے، جھروکے سے خود بادشاہ اس کا تماشہ دیکھتا، محتاجوں میں روپیہ تقسیم کیا جاتا اور علماء کو انعام واکرام سے نوازا جاتا [۲]، شاہجہاں نامہ کا مولف ۱۰۴۹ھ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"۳۱ فروردی کو شعبان کی چودھویں شب آئی یہ لیلۃ البرات کے نام سے مشہور ہے، بڑی عظمت اور برکت کی رات سمجھی جاتی ہے، اس رات دعا مقبول ہوتی ہے اور قضا و قدر کی طرف سے عمر اور رزق ملتا ہے، صلحا اور اتقیا اس رات کی بڑی قدر کرتے ہیں، وہ اس مبارک رات میں عبادت کرتے ہیں، محتاجوں کو روپیے بھی تقسیم کیے جاتے ہیں۔ بادشاہ کے حکم سے اس رات کو صحن میں دروازوں پر دار السلطنت کے قلعہ کے اوپر چراغاں کیا جاتا ہے اس روز اتنی روشنی ہوتی ہے کہ آفتاب کی روشنی دھیمی نظر آنے لگتی ہے......" [۳]

جشن نوروز ان مذہبی تہواروں کے علاوہ ہندوستان کے مسلمان سلاطین نوروز کا غیر مذہبی تہوار بھی مناتے رہے، یہ ایران اور پارسیوں بلکہ وسط ایشیا کا تہوار ہے، جو پہلی فروردین کو منایا جاتا ہے، اس کی جھلکیں

[۱] عفیف سو لہوان مقدمہ ص ۳۶۵ [۲] بادشاہ نامہ جلد ۲ ص ۱۶۸ [۳] عمل صالح الموسوم بہ شاہجہاں نامہ ص ۸۶ - ۲۰۵

سے ایرانی سال کا آغاز ہوتا ہے، اور موسم بہار بھی شروع ہو جاتا ہے، کیونکہ آفتاب برج حمل میں داخل ہوتا ہے، اسی خوشی میں یہ جشن بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔

سلاطین دہلی کے عہد کا نوروز سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ دونوں کے عہد میں بڑے تزک و احتشام سے یہ جشن منایا جاتا تھا، امیر خسرو نے سلاطین دہلی میں کیقباد کے جشن نوروز کا جو منظوم حال مثنوی قران السعدین میں لکھا ہے اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود اس کے ذکر سے کس قدر محظوظ ہوتے تھے، وہ لکھتے ہیں کہ اس موقع پر محل میں ہر قسم کی زینت و آرایش کی گئی، اس کے کنگرے بھی سجائے گئے، محل کی نو محرابوں میں زربفت کے پردے لٹکے ہوئے تھے، جشن گاہ میں پانچ چتر تھے، ایک سیاہ، دوسرا سفید، تیسرا سرخ، چوتھا سبز اور پانچواں پھولوں کا، سیاہ چتر میں نقش و نگار بنے ہوئے تھے، اور جا بجا موتی اس طرح لٹکے ہوئے نظر آتے تھے جیسے سیاہ ابر میں بوندیں پڑ رہی ہوں، سفید چتر مدور تھا، اس کی چھت، دروازے اور ستون سنہرے تھے، اور یہ بھی موتیوں سے جگمگا رہا تھا، سرخ چتر میں موتیوں کے علاوہ یاقوت بھی تھے، سبز چتر میں سبز اطلس لگائی گئی تھی، اور اس پر موتیوں کا ایک سبز سایہ دار اور بار آور درخت بنایا گیا تھا، جو معلوم ہوتا تھا کہ زمین کے سبزہ کو زمرد بنا رہا ہے، پھولوں کا چتر چمن کی طرح کھلا ہوا تھا۔ دربار کے دائیں بائیں سیاہ اور شاہی پرچم لہرائے گئے تھے، دونوں طرف دو ہزار گھوڑوں کی صفیں کھڑی کی گئی تھیں، گھوڑے جڑاؤ زیور پہنے تھے، دائیں طرف گھوڑوں پر سیاہ جھولیں پڑی تھیں، بائیں طرف کے گھوڑوں کی جھولیں سرخ تھیں، ان کے پیچھے ہاتھیوں کی قطار اس طرح تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ لوہے کے قلعہ پر پاکھر پڑی ہے، دربار کے بیچ میں زر و جواہر سے مرصع ایک مصنوعی چمن بنایا گیا تھا، اس کے مصنوعی درختوں کی شاخوں میں پھل اس طرح لٹک رہے تھے جیسے ابھی ٹپک پڑیں گے۔ اس کی چڑیاں ایسی معلوم ہوتی تھیں کہ ابھی اڑنا چاہتی ہیں، بہت سے درخت موم کے بھی تھے، اور ایسے دلفریب گلدستے تیار کیے گئے تھے کہ سبزہ، لالہ، ریحان اور بید کا ایک چمن نظر آتا تھا، زری کے کام سے بھی دربار کو جنت نگاہ بنایا گیا تھا، اطلس، زربفت اور یاقوت کے پردے

دیواروں پر لٹکتے تھے جس سے دیوار کے پتھر بھی یاقوتی رنگ کے معلوم ہو رہے تھے، فرش میں بھی موتی اور سونے کا کام تھا، غرض پورا محل سونے سے ایسا آراستہ کر دیا گیا تھا کہ فردوس بریں کا دھوکا ہوتا تھا، اور جب جشن منانے کے لیے سلطان کی آمد آمد کا غلغلہ ہوا تو چاؤش نے نعرے لگائے، اور سلطان کے محافظ دستے ادھر ادھر حرکت کرنے لگے۔ شحنۂ بارگاہ نے صفیں سیدھی کیں، کچھ دستے تلواریں لیے دائیں بائیں ہو گئے، جب بادشاہ سونے کے تخت پر آکر بیٹھا تو اس کا تاج جگمگانے لگا، اس کی قبا میں سونے کی اعلیٰ درجہ کی صنعت کاری تھی، اس کے تاج، قبا اور پٹکے میں موتی اس طرح لٹکے ہوئے تھے کہ پٹکے کی چمک کمر تک اور قبا کی گلے تک اور تاج کی سر تک تھی، دربار کی زمین اور فضا نافۂ چینی سے معطر کی گئی تھی، جب بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوا تو نذریں پیش ہونے لگیں، محاسب اس کو لکھتا جاتا تھا اور حاجب پکار پکار کر تفصیل بیان کرتا جاتا تھا۔[۱]

اس موقع پر دربار کے خان اور امرا سلطان کی خدمت میں پیش کیے جاتے اور ان میں سے ہر ایک کے کارنامے بھی بیان کیے جاتے، بلبنی عہد میں جشن نوروز کے موقع پر دربار کے ایک معزز خان کشلی خان کی مدح میں شاہی مطربوں نے ایک نظم سنائی، مجلس ختم ہونے کے بعد کشلی خان نے مدح نگار شاعر خواجہ شمس معین کو بلا کر مجلس نوروزی کا کل پر تکلف اور قیمتی سامان دیدیا اور مطربوں کو دس ہزار ٹنکے انعام دیے۔[۲]

عہد اکبری کا نوروز تمدن کی ترقی کے ساتھ اس جشن کے زینت و آرایش میں اضافہ ہوتا گیا، اکبر کے عہد میں یہ جشن انیس دن تک منایا جاتا تھا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ ان ایام میں انواع و اقسام کی زینت و آرایش ہوتی جس کو دیکھ دیکھ کر حاضرین فرط مسرت میں نعرے بلند کرتے، ہر پہر کے آغاز پر نقارے بجتے، مطرب اپنے نغموں سے لوگوں کو محظوظ کرتے، راتوں کو چراغاں کیا جاتا، اور جشن سے پہلے اور آخری دن بکثرت صدقہ دیا جاتا، تحفے اور ہدیے بھی تقسیم ہوتے۔[۳]

اکبر کے ستائیسویں سال جلوس میں جو جشن منایا گیا، اس میں امرا کے مشورے سے سراؤں اور شفاخانوں

---

۱ قران السعدین ص ۸۵–۳۰، بزم مملوکیہ ص ۳۸–۴۳، ۲ برنی ص ۱۴۱–۱۴۳، فرشتہ ج ۱ ص ۸، بزم مملوکیہ ص ۱۸۱–۱۷۹، ۳ آئین اکبری ج ۱ آئین ۲۲

کی تعمیر ہوئی، چھوٹی چھوٹی چڑیوں کے شکار کی ممانعت کر دی گئی تھی، بازاروں کی نگرانی کے لیے داروغہ کا تقرر ہوا، اور بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں وقائع نگار مقرر کیے گئے، بارہ برس سے کم عمر کی لڑکیوں کی شادی کی ممانعت ہوئی، شاہی حکم کی اجازت کے بغیر قتل کی سزا روک دی گئی وغیرہ وغیرہ۔[1]

اکبر کے اٹھائیسویں سال جلوس کے نوروز کا ذکر کرتے ہوئے طبقات اکبری کا مؤلف لکھتا ہے:۔

اس سال نوروز کے موقع پر دیوان عام اور دیوان خاص کے ایوانوں، ستونوں اور دیواروں کو قیمتی کپڑوں، مصور پردوں سے مزین کیا گیا، اور اس طرح آراستہ کیا گیا کہ دیکھ کر لوگ حیرت میں آ جاتے تھے، صحن میں زردوزی کا شامیانہ لگایا گیا، اس کو بھی زربفت سے آراستہ کیا گیا اور اس پر ایک تخت بچھایا گیا جو سونے، یاقوت اور موتیوں سے مرصع تھا اور فردوس کے لیے باعث رشک تھا۔

صفحۂ طاق بیاراستند   پردۂ زربفت فلک ساختند

تخت زدند [illegible] ختند   عرش دگر بر زمیں انگیختند

اٹھارہ روز تک یہ آراستگی رہی، رات کو طرح طرح کے فانوس روشن کیے جاتے، امراء دن یا رات کو ایک یا دو بار بادشاہ کے پاس آکر بیٹھتے، ہند اور فارس کے ارباب نغمہ، امراء اور اہل خدمت شاہانہ عنایات سے سرفراز کیے جاتے، فتحپور اور آگرہ کے بازاروں کی بھی آئین بندی ہوتی تھی اور اطراف جوانب سے لوگ اس کا تماشہ دیکھنے آتے جو انھوں نے نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ سنا تھا، ہفتہ میں ایک دن جو چاہتا بادشاہ کے پاس جا سکتا تھا بقیہ دنوں میں صرف امرا اور خاص خاص لوگ آ سکتے تھے، نوروز کے دن جب بادشاہ تخت پر بیٹھتا تو امرا صف بستہ ترتیب کے ساتھ کھڑے رہتے، نوروز کے آخری دن بھی یہ مجلس اسی شان سے ہوتی اور امرا شاہانہ نوازشوں سے سرفراز کیے جاتے، کسی کو گھوڑے عنایت ہوتے، کسی کو خلعت ملتا

[1] اکبر نامہ جلد ۳ ص ۳۴۹

کسی کو علوفہ میں اضافہ ہوتا، بہتوں کو جاگیریں ملتیں، کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کو کچھ نہ ملتا ہو، امراء نذرانے پیش کرتے، بڑے بڑے امرا میں سے کوئی نہ کوئی محل کے اندر حضور آتا، جس کے ساتھ مہمانی کے تمام لوازم برتے جاتے، نذرانے میں عموماً ہندوستان، خراسان اور عراق کے کپڑے ہوتے، موتی، لعل، یاقوت اور طلائی آلات بھی پیش کیے جاتے، عربی اور عراقی گھوڑے، کوہ پیکر ہاتھی، اور بہت سے اونٹ بھی ہوتے، اس موقع پر شاہم خاں جلائر بنگالہ اور راجہ بھگوانداس لاہور سے آکر قدم بوس ہوئے، اور یہ طے پایا کہ یہ جشن ہر سال اسی طرح منایا جائے۔[1]

اکبر نے یہ بھی جدت کی تھی کہ دیوان عام و خاص کے گرد جتنے ایوان تھے، ان میں سے ہر ایک ایک امیر کے سپرد کیا کہ وہ اپنے ذوق کے مطابق اس کو آراستہ کرے، خود اس کے دولت خانۂ خاص کو شاہی ملازم سجاتے، اس کے در و دیوار پر پرتگالی بانات، رومی و کاشانی مخمل، گجراتی زربفت و کمخواب، تاش تمامی منقش بیک اور کشمیر کی شالیں لٹکائی جاتیں، فرنگ و چین کے زرنگار پردے لگائے جاتے، نیچے ایرانی اور ترکستان کے قالین ہوتے، شیشہ آلات میں عجیب و غریب آئینے، فانوس، کنول، قندیلیں اور قمقمے لٹکائے جاتے، صحن میں خیمے نصب ہوتے، اور صحنوں میں پھولوں کے تختے لگا کر ان کو رنگین و حسین بنایا جاتا، امرا اپنے ذوق کے مطابق اپنے اپنے ایوانوں کی آئین بندی کرتے، مثلاً شاہ فتح اللہ شیرازی اپنے ایوانوں کو علم ہیئت کے آلات، گھڑیالوں، گھنٹوں، نظام فلکی کے نقشوں، اصطرلابوں، جرثقیل کی کلوں وغیرہ سے سجاتے، بعض امرا اپنے ایوانوں کو حربی اسلحہ سے آراستہ کرتے اور بعض اپنے ایوانوں کے ساتھ ایک باغیچہ لگا دیتے، غرض اس جشن میں ایک بہت عمدہ نمائش بھی منعقد ہو جاتی جس میں ہر قسم کی صنعتوں کے نمونے ہوتے تھے،

جہانگیر اپنی تزک میں جشن نوروز کی زینت و آرائش کا حال بہت ہی لطف سے تحریر کرتا ہے

[1] طبقات اکبری جلد ۲ ص ۵۰۲ - ۴۰۳ ترجمہ آزاد ہے

مثلاً گیارہویں سال جلوس میں لکھتا ہے کہ آفتاب جب برج حمل میں گیا تو دیوان خاص اور دیوان عام کو خوب سجایا گیا، صحن میں بارگاہ اور شامیانے نصب کیے گئے اور ان کو فرنگی پردوں، مصور، زربفت اور نادر کپڑوں سے آراستہ کیا گیا، اور جب تخت پر آکے بیٹھا تو شاہزادے، امراء اور ارکان دولت کورنش بجا لائے اور مبارکباد پیش کی، دربار کے مشہور ماہر موسیقی نادعلی سے کہا گیا کہ اس دن نذرانے میں جو نقد و جنس بھی پیش ہوگی سب اس کی ہوگی، دوسرے روز بھی نذرانے پیش ہوئے، چوتھے روز خواجہ جہان کا نذرانہ پیش ہوا جو اس نے آگرہ سے بھیجا تھا، اس میں ہیرے کے چند ٹکڑے، کچھ دانے موتی کے تھے، مرصع آلات کپڑے اور ہاتھی بھی تھے، جن کی مجموعی قیمت پچاس ہزار روپے تھی، پانچویں دن کنور کرن نے ایک سو مہر، ایک ہزار روپے، ایک زنجیر فیل اور چار راس گھوڑے پیش کیے، ساتویں روز آصف خاں کے منصب میں ہزاری ذات و دو ہزار سوار کا اضافہ کیا گیا، نقارہ اور علم بھی مرحمت کیا گیا، اسی روز جمال الدین حسین کا نذرانہ پیش ہوا جو بہت عمدہ تھا اس میں ایک مرصع خنجر تھا جس کے اوپر ایک زرد یاقوت لگا ہوا تھا، اس کا حجم مرغی کے آدھے انڈے کے برابر تھا، اتنا لطیف اور بڑا زرد یاقوت پہلے دیکھنے میں نہ آیا تھا، کچھ پرانے زمرد بھی تھے، بہرحال پنجہزاری ذات دسہزاری تھا، اس کے منصب میں ہزار سوار کا اضافہ کیا گیا، آٹھویں دن صادق خاں اور ارادت خاں کے منصب میں اضافہ ہوا، نویں روز خواجہ ابوالحسن نے جواہرات، مرصع آلات اور قیمتی کپڑے پیش کیے، جن کی قیمت چالیس ہزار روپے ہوگی، تاتار خاں بکاول بیگی نے ایک قطعہ لعل، ایک قطعہ یاقوت، ایک عدد مرصع تختی، دو عدد انگوٹھیاں اور کچھ کپڑے نذرانے میں گذرانے، دسویں روز راجہ مہاسنگھ دکن کے تین زنجیر فیل قبول کیے گئے، اسی روز مرتضیٰ خاں لاہور کا فرستادہ زربفت پیش کیا گیا، اور دیانت خاں نے موتی کی دو تسبیح دو قطعہ لال، چھ دانے بڑے موتی پیش کیے، اسی روز بہادر خاں حاکم قندھار نے سات راس عراقی گھوڑے اور کچھ قیمتی کپڑے بھیجے، ارادت خاں اور راجہ سورج مل ولد راجہ باسو کے نذرانے بھی پیش ہوئے، تیرہویں روز عبدالسبحان کے منصب میں اضافہ ہوا، پندرہویں روز مظفر خاں کو ٹھٹھ کی ولایت دی گئی، سولہویں،

اعتقاد خاں ولد اعتمادالدولہ کے نذرانے پیش ہوئے، سترہویں روز تربیت خاں نے نذر گذرانی، اٹھارہویں روز آصف خاں کے گھر پر گیا، اس کا گھر ایک کروہ کے فاصلہ پر تھا لیکن اس نے نصف راستہ پر مخمل اور زربفت وغیرہ بچھا دیے تھے، وہاں آدھی رات تک قیام رہا، اس نے جو جواہرات مرصع آلات اور کپڑے وغیرہ نذرانے میں دیے ان کی قیمت ایک لاکھ چودہ ہزار روپے تھی، ان کے علاوہ چار راس گھوڑے، ایک راس اونٹ اور ایک طلائی خوانچہ بھی پیش کیے، گیارہویں روز اعتمادالدولہ کے گھر گیا، وہاں جو نذرانے پیش ہوئے ان میں بڑی نفاست تھی۔ دو موتی تھے، جن کی قیمت تیس ہزار روپے تھی، ایک قطعہ لعل قطبی تھا جو بائیس ہزار روپے میں خریدا گیا تھا۔ دوسرے موتیوں اور لعل کی قیمت ملا کر ایک لاکھ دس ہزار روپے کے نذرانے تھے، اس میں کچھ قیمتی کپڑے بھی تھے، جن کی قیمت پندرہ ہزار روپے تھی۔ وہاں ایک پہر رات تک بڑی اچھی صحبت رہی، اسی روز نورمحل بیگم کو نورجہاں بیگم کا لقب عطا کیا گیا، بارہویں روز اعتبار خاں کی پیش کش سامنے آئی، اس میں ایک برتن مچھلی کی شکل کا تھا جس میں جواہرات لگے ہوئے تھے، اس کے علاوہ مرصع آلات اور کپڑے تھے جن کی مجموعی قیمت چھپن ہزار روپے تھی۔ انیسویں روز آفتاب کا روز شرف تھا، اس لیے مجلس دولتخانہ اور بھی سجائی گئی۔ دو گھڑی دن گذرنے کے بعد تخت پر آکر بیٹھا، خرم نے اس وقت ایک لعل پیش کیا، جس میں بڑی صفائی اور آب و تاب تھی، اس کی قیمت اسی ہزار روپے تھی، اس فرزند کا منصب پانزدہ ہزاری ذات و ہشت ہزار سوار سے بڑھ کر بیست ہزاری ذات و دہ ہزار سوار کیا گیا اور اسی روز وزن قمری بھی لیا گیا[1]

محل کے اندر نورجہاں بھی اسی دھوم دھام سے نوروز مناتی تھی، اس کی سرکار کے نجومی نوروز کے دن کا جو رنگ مبارک بتاتے اسی رنگ کی مکان میں قلعی ہوتی، اسی رنگ کے فرش اور پردے ہوتے، اسی رنگ کی پوشاک تمام بیگمات اور کنیزیں پہنتیں، ہاتھی، گھوڑے، اونٹ اور دوسری سواریوں کی پوشش بھی اسی رنگ کی ہوتی، مخمل، مشجر اور اطلس بھی اسی رنگ کی استعمال کیجاتی، ایک خاص

---

[1] تزک جہانگیری ص ۱۵۶-۵۸

وقت میں جہانگیر محل کے اندر جاکر نورجہاں کے ساتھ ایک شہ نشین پر بیٹھتا، نورجہاں روپے تصدق کرکے فقیروں اور مسکینوں میں تقسیم کراتی، اس روز محل کے دروازے پر محتاجوں کا ہجوم ہوتا، نقارخانے سے شہنائی کی نوبت بھی بجتی رہتی، پھر نورجہاں اور جہانگیر دونوں بالاخانے پر آتے تو ان کے سامنے سے جلوس گذرتا، فیل بان ہاتھیوں کے کرتب، شہسوار شہسواری کا کمال اور فوجی اپنے کرتب دکھاتے پھر شہر اور سلطنت کے صناع اپنی صناعیوں کا مظاہرہ کرتے، اور شہر کے مختلف حصوں میں نورجہاں کی طرف سے کھانے پینے کا انتظام ہوتا،[له]

شاہجہانی دور اپنی شان و شوکت اور لطافت اور نفاست میں منتہائے کمال تک پہنچ گیا تھا، اس لیے نوروز کا جشن بھی ان ساری خوبیوں اور لطافتوں کے ساتھ منایا جاتا تھا، بادشاہنامہ کا مؤلف اس جشن کا ذکر کرتا ہے تو اس کا قلم رقص کرنے لگتا ہے اور اس کی انشاپردازی کا حسن بہت بڑھ جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے ترجمہ میں وہ خوبی پیدا نہ ہوسکے گی، اس لیے ہم صرف اس کے خلاصہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

شاہجہاں کے آٹھویں سال جلوس میں عید الفطر اور نوروز دونوں ساتھ ساتھ پڑ گئے اور دونوں کے جشن ایک ساتھ منائے گئے، اس لیے دربار کی زینت و آرائش کی کوئی حد باقی نہ رہی، دیوان عام اور خاص کے سامنے مخمل اور زربفت کے خیمے لگائے گئے، ان میں ایک خیمہ گجرات کے صناعوں نے ایک لاکھ روپئے میں تیار کیا تھا، خیموں کے ستون سونے اور چاندی کے تھے، فرش میں بھی سونے کا کام تھا، تختگاہ کے پاس ایک اسبک کے نیچے طلائی مجمر تھا، اس کے سامنے ایک زرنگار شامیانہ تھا جس میں موتی ٹکے ہوئے تھے، اور اس کے ستون سونے کے تھے، یمین الدولہ نے اس کو ایک لاکھ روپئے میں تیار کرایا تھا،

له سید امجد علی اشہری مصنف "نورجہاں بیگم کی سوانح عمری" نے نوروز کے موقع پر نورجہاں کے بہت سے لطیفے لکھے ہیں جو کسی مستند تاریخ میں نظر سے نہیں گزرے اسلیے احتیاطاً نظرانداز کر دیے جاتے ہیں لیکن وہ دلچسپ ہیں اور ممکن ہو کہ صحیح ہوں۔

مرصع چتر پر موتیوں کا غلاف تھا، چھوٹے چھوٹے تختوں میں میناکاری کے اعلیٰ نمونے نظر آتے تھے، چاندی اور سونے کی خرگاہیں جابجا نصب تھیں، اور در و دیوار نقرہ بافت گجراتی، زربفت عراقی، دیبائے رومی چینی اور پردہائے فرنگی سے مزین تھے، اس کے درمیان تخت طاؤس تھا۔[له]

اورنگ زیب یہ جشن نہیں مناتا تھا، اس نے اس کو اسراف سمجھ کر روک دیا تھا، لیکن اس کے بعد کے بادشاہوں نے اسے آخر وقت تک منایا، بہادر شاہ ظفر کے جشن کا اندازہ ذوق کی ایک نظم کے حسب ذیل اشعار سے ہوگا جو انھوں نے ایک جشن کے موقع پر کہی تھی۔

خسروا اس کے ترا فرخ جشنِ نوروز — آج ہے بلبلِ تصویر تالک زمزمہ سنج
خبر عیش تری دے ہے چمن کو جاکر — زرِ گل پیک صبا پائے نہ کیونکر پارنج
بادۂ جوش جوانی کی ہے گویا اک موج — تن پیرانہ کہن سال پہ ہر چین شکنج
لایا ہے معنی رنگیں سے یہ لعل خوش رنگ — ذوق جو مدح و ثنا میں ہے ترے گوہر سنج
خسروا ہوتا ہے اس رنگ سے معلوم یہ رنگ — رنگ نوروز جو ہے اب کی ہے رنگ نارنج
بزم رنگیں میں تری رنگ طرب ہو ہر روز — اور تری خاطر اقدس پہ کبھی آئے نہ رنج

جشن نوروز اور عوام | عوام بھی جشن نوروز مناتے تھے اور دربار میں جو کچھ ہوتا تھا اس کی نقل اپنی حیثیت کے مطابق اپنے گھروں پر کرتے، وہ بھی اپنے مکانوں کی صفائی کراتے، ان کو آراستہ و پیراستہ کرتے، اعزہ و احباب کی دعوت کرتے، تفریح گاہوں میں جاکر جشن کی مسرتوں سے محظوظ ہوتے، بازاروں کی سیر کرتے جن کی زینت و آرائش پورے شباب پر ہوتی، راتوں کو ان میں چراغاں بھی ہوتا، جابجا طرب و نشاط کی محفلیں بھی ہوتیں، مگر عوام کا زیادہ وقت دربار کی زینت و آرائش دیکھنے میں گذرتا جہاں زرق برق ہاتھی جھومتے اور مرصع گھوڑے کلیلیں کرتے رہتے، حلوائی طرح طرح کی مٹھائیوں کے درخت، مٹھائیوں کے پھل، پھول اور پتے یا کسی مسجد اور روضہ کی شکل بناتے، باغبان اور

له بادشاہ نامہ ج ۱ حصہ ۲ ص ۷۷، نیز دیکھو ج ۱ ص ۲۵۶، ۲۹۷، ۳۶۴، ۴۰۸، ۴۱۳، ۴۷۳ حصہ دوم ص ۸ وغیرہ وغیرہ۔

گلفروش پھولوں کے ہار اور زیورات بنانے میں اپنا کمال دکھاتے، کاغذ فروش رنگ برنگ کے کاغذی گلدستے تیار کرتے، میوہ فروش پھلدار درختوں کی صنعت دکھاتے، پارچہ فروش انواع واقسام کی بیرقین اور جھنڈیاں بناتے، اور یہ سب کے سب صناع اپنی صناعیوں کو بادشاہ اور ان کے امراء کی خدمت میں پیش کرتے اور انعام پاتے۔

لیکن جو جشن اتنے بڑے پیمانہ پر منایا جاتا تھا، اب ہندوستان سے بالکل ختم ہوگیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق حکومت سے زیادہ اور عوام سے کم تھا، اس لیے حکومتوں کے ساتھ اسکا بھی خاتمہ ہوگیا۔

عید گلابی یا آب پاشاں یہ تقریب برسات کا پہلا چھینٹا پڑنے پر منائی جاتی تھی، اس موقع پر صراحیوں میں عرق گلاب بھر کر لوگوں پر چھڑکا جاتا، یہ بھی ایرانی تقریب تھی جس کو شاہان ایران منایا کرتے تھے، اس کو عید ترکان بھی کہتے تھے[1]۔ جہانگیر اپنے نویں سال جلوس میں لکھتا ہے:

"مجلس گلاب پاشی کہ از زمان قدیم بہ آب پاشی مشہور است واز رسوم مقررہ پیشینیان ست منعقد گشت۔" (ص ۱۳۱)

بادشاہ نامہ میں ہے:-

"روز دوشنبہ سلخ شوال کہ روز تیر از ماہ تیر بود جشن عید گلابی انعقاد یافت، بادشاہ زادہانے کامگار و یمین الدولہ صراحی ہائے مرصع و دیگر نو نہان نامدار صراحیہائے میناکار وزریں وسیمیں و پر از گلاب و عرق فتنہ و عرق بہار از نظر مقدس گذرانیدند۔" (ج ا ص ۲۰۴)

یہ عید گلابی اورنگ زیب بھی مناتا تھا، شہزادے اور امراء مرصع اور مینا کار صراحیوں میں گلاب بھر کر اس پر چھڑکا کرتے تھے (عالمگیر نامہ ص ۶۲۳)

شاہانہ جشن کے فوائد ان جشنوں میں جن تکلفات کا مظاہرہ ہوتا رہا وہ اسلامی نقطۂ نظر سے سراسر اسراف اور

[1] عمل صالح جلد اول ص ۳۷،۴۴

لہو ولعب ہے، اور یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا اس قسم کے مسرفانہ اور عیاشانہ تکلفات سے سلطنت کی بنیاد کھوکھلی نہیں ہوگئی؟ اس پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان سے ایک شاہانہ تہذیب و تمدن کا ضرور اندازہ ہوتا ہے، حکمران طبقہ تو اس نمود و نمائش کے ذریعہ اپنی شان و شوکت کا اظہار کرتا تھا، لیکن اس زینت و آرائش میں جو حسن سلیقہ ظاہر ہوتا وہ اس ملک کی تہذیبی اور تمدنی زندگی کا ضروری عنصر بنتا چلا گیا اور آج بھی کسی موقع پر جو شان و شوکت اور نفاست و لطافت دکھائی دیتی ہے، وہ اسی تمدن کی یادگار ہے، پھر ایسے موقع پر جو تحائف پیش کیے جاتے، جو فرش و فروش بچھائے جاتے زینت و آرائش کے جو سامان کیے جاتے، حتی کہ آتش بازی کے جو تماشے دکھائے جاتے ان سے صنعت و حرفت کو بڑا فروغ ہوتا، ان میں سے بعض صنعتیں اب بھی موجود ہیں، جو اس دور کی تہذیب آبنا کی کی یاد دلاتی رہتی ہیں۔

اجتہاد

مترجمہ مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی

دسمبر ۱۹۵۷ء کے آخر اور جنوری ۱۹۵۸ء کے شروع میں دور حاضر کے بعض اہم اسلامی مسائل پر اظہار خیال کے لیے لاہور میں علماء و مفکرین کی جو بین الاقوامی کانفرنس ہوئی تھی، اس میں اجتہاد پر بھی مقالات پڑھے گئے تھے، معارف میں اس مسئلہ پر مضامین نکل چکے ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک دو اہم مضامین کا ترجمہ معارف میں شائع کر دیا جائے، اس نمبر میں مصر کے نامور فاضل ڈاکٹر مصطفےٰ احمد زرقاء کے مقالہ کا جو فقہ اسلامی اور یورپ کے جدید قوانین دونوں کے ماہر ہیں ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ "م"

اجتہاد پرانا موضوع ہے، سلف نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے، اس کی حقیقت، ضرورت اور شرطوں کو بیان کیا ہے اور ان ضروری اوصاف اور خصوصیات کی وضاحت بھی کی ہے جو مجتہدین میں بدرجۂ کمال پائے جانے چاہئیں، متاخرین کا خیال ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا۔ یہ اجتہاد کے قدیم مباحث ہیں اور ان کی آج بھی شرح و تفصیل کیجا سکتی ہے، اور اسے نیا موضوع اس طرح بنایا جا سکتا ہے کہ اس پر نئے سرے سے بحث کیجائے، اور اس کے ایسے نئے نئے پہلو اور گوشے سامنے لائے جائیں جن پر ابھی تک یا تو غور ہی نہیں کیا گیا ہے یا بہت کم غور کیا گیا ہے۔

اس مذاکرہ میں مجھے صرف ۱۵ منٹ کا مختصر وقت دیا گیا ہے، جس میں اجتہاد کے تمام گوشوں اور دائروں سے تعرض کرنے کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے اس تنگ وقت میں اجتہاد کے بعض جدید مسائل

پر ماضی کی روشنی میں نئے انداز سے بحث و گفتگو پر اکتفا کیا جائیگا تاکہ مستقبل کے لیے سامان بصیرت ہو۔

فقہاء کی اصطلاح میں اجتہاد کا مفہوم اجتہاد کی فقہی تعریف سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نئے واقعات و حادثات کے لیے شریعت کے بیان کیے ہوئے تفصیلی دلائل سے شرعی احکام کو مستنبط کرنے کی صلاحیت و قوت کا نام ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر واقعہ اور ممکن چیز کے متعلق شریعت میں ایسے واضح اور کافی دلائل موجود ہیں جو تحقیق و تفتیش کرنے والے مجتہد کی رہنمائی اور حکم شرعی تک پہنچانے میں مفید اور معاون ہو سکتے ہیں۔

علماء اور مجتہدین شریعت کے بیان کے مطابق دلائل شرع چار چیزیں ہیں۔

(۱) نص قرآنی (۲) منصوص نبوی (اپنی دلالت کی تمام نوعیتوں اور شکلوں کے مطابق) (۳) علمائے امت کا اجماع (چاہے وہ کسی زمانہ کے ہوں) (۴) قیاس۔

ان چاروں چیزوں سے تین اور ضمنی و تبعی مآخذ نکلتے ہیں، ان کے معتبر ہونے کا ثبوت بھی قرآن و حدیث میں موجود ہے۔

(الف) استحسان: قیاس کے مقرر اور ثابت قاعدوں کے اقتضاء کے برخلاف کسی حکم کو مستثنیٰ کرلینا یہ خلاف ورزی کچھ اعتبارات کی بنا پر کیجاتی ہے۔

(ب) استصلاح یا مصالح مرسلہ: اصلاحی اور تنظیمی ضرورتوں کے پیش نظر ایسی صورتوں میں احکام شرع کا اثبات و استخراج جن میں کوئی حکم یا ممانعت موجود نہ ہو، اور اس سے اصول قیاس کی خلاف ورزی بھی کرنی پڑے۔

اس موقع پر ان لوگوں کی رائے سے بحث نہیں جو استصلاح یا استحسان یا قیاس کو معتبر نہیں سمجھتے کیونکہ ان کی مخالفت بے نتیجہ اور بے فائدہ ہے۔

(ج) عرف: بشرطیکہ وہ شرعی نصوص اور ثابت شدہ اصولوں سے متصادم اور متعارض نہ ہو۔

اجتہاد کے مفہوم کی وضاحت اور شرعی دلائل کی تحدید کے بعد اسلامی قانون کے دائرہ میں اجتہاد کے

دور کی تفصیل بیان کیجاتی ہے۔

دور اجتہاد اس سے اجتہاد کے وہ خدمات مراد ہیں جو وہ انجام دے چکا ہے اور آیندہ بھی اسلامی قانون کی فقہی بنیاد قائم کرنے اور اس کے احکام کی تطبیق میں وہ انجام دے سکتا ہے۔

اجتہاد کے خدمات اور کارناموں کے ذکر میں مناسب ہوگا کہ اسلامی شریعت اور فقہ اسلامی میں اس کا درجہ اور مقام معلوم کر لیا جائے۔

ہم علی الاعلان اور پورے دعوی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اجتہاد اسلامی شریعت کی روح اور فقہی زندگی کا سرچشمہ ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ شریعت اسلامی بغیر اجتہاد کے اپنا فرض ادا نہیں کر سکتی اور نہ اس کے بغیر کوئی ایسی زندہ و پایندہ فقہ اسے حاصل ہو سکتی ہے جو انسانی مصالح اور ضروریات کے لیے مستقلاً اور ہمیشہ کے لیے کارآمد ہو سکے۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت کے آغاز یعنی عہد نبوی ہی سے اجتہاد شروع ہو گیا تھا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود متعدد مواقع پر اجتہاد فرمایا ہے، اور جب آپ نے صحابۂ کرام کو باہر کہیں بھیجا تو انھوں نے بھی وہاں اجتہاد کیا، اس سلسلہ میں ایک بڑے صحابی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ ہے کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن میں قاضی اور معلم بنا کر بھیجا تو ان سے دریافت فرمایا کہ کس طرح لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو گے۔ حضرت معاذ رضؓ نے عرض کیا کتاب اللہ کی مدد اور روشنی میں معاملات کا تصفیہ کروں گا، آپ نے پوچھا اگر کتاب اللہ سے اس کا حل نہ نکلا تو کیا طریقہ اختیار کرو گے، انھوں نے جواب دیا خدا کے رسول کی سنت کو بنیاد اور ماخذ قرار دوں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر ان دونوں میں بھی کامیابی نہ ہو سکے تو کیا کرو گے۔ حضرت معاذ رضؓ نے جواب دیا، اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس تلاش و اجتہاد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھوں گا اور پوری سعی و کاوش سے راہ صواب اور روح شریعت سے قریب ترین امر حق کو معلوم کروں گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ جواب سنکر بہت مسرور ہوئے اور اپنی خوشی کا اظہار ان لفظوں میں کیا۔

الحمد للہ الذی وفق رسول رسولہ الی ما یرضیہ

خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول کے فرستادہ کو اپنی رضا کی توفیق دی۔

اجتہاد کے اسلامی فقہ و قانون کی روح اور اصل و بنیاد ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ اسلامی مشن اور اس کی خصوصیات سے بہت گہرا اور مضبوط تعلق رکھتا ہے، اس لیے اسلامی شریعت میں اجتہاد کی حقیقت اور حیثیت معلوم کرنے کے لیے ہمیں اسلام کے مقاصد اور خصوصیات پر بھی نظر ڈال لینی چاہیے، تاکہ اجتہاد سے ان کے تعلق کی غایت اور غرض معلوم ہو جائے۔

اسلام کے مقاصد اور خصوصیات اسلام کا مقصد اور مشن کتاب و سنت کے نصوص کے مطابق ہر زمانہ کے اجتماعی و انفرادی معاملات و مسائل میں پوری نوع انسانی کی عام اصلاح اور رہبری ہے اور ایک مسلمان کا اسلام کے متعلق یہی اعتقاد ہے، اس میں کسی قسم کی کمی اسلام سے انحراف اور روگردانی کی علامت ہے۔

اس مقصد سے اسلام کی تین خصوصیات ثابت ہوتی ہیں:-

۱- اسلام تمام آسمانی اور الٰہی شریعتوں میں سب سے آخری شریعت ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخری رسول ہیں۔ اسلام کے بعد کوئی اور شریعت اسے منسوخ نہیں کر سکتی اور نہ اب کوئی دوسرا رسول آئیگا۔

۲- اسلام کی دعوت عالمگیر، دائمی اور ہمیشہ کے لیے ہے، وہ کسی محدود وقت اور متعین زمانہ کے ساتھ خاص نہیں کہ اس کے بعد لوگوں کو بذات خود اپنی زندگی کی اصلاح و تنظیم کی فکر کرنی پڑے اور وہ اسلامی قانون کی پیروی اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنا چھوڑ دیں۔

۳- اسلام کا قانونی نظام مکمل اور جامع ہے اور جن شرعی اصولوں اور احکام سے اس کی تشکیل و ترتیب ہوئی ہے وہ مستقبل میں تمام ہونے والی یا ممکن الوقوع اشیا کے لیے کافی اور سب پر محیط ہیں،

اور یہی قانون اس لایق ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک و قوم کے افراد کی قانونی ضرورتوں کا حل فراہم کرسکے، کیونکہ اس کے اندر لچک اور عموم ہے اور اس میں مستقل اور مستثنیٰ تدبیروں اور صورتوں اور مختلف حالات کی مکمل رعایت کی گئی ہے، چنانچہ فقہا اور ماہرین قانون نے جابجا فقہی اور قانونی کتابوں میں اسکی تصریح کی ہے کہ موجودہ یا آیندہ زمانہ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں پیش آسکتا جس کے متعلق اسلام میں نص، قیاس اور اجتہاد کی بنیاد پر کوئی حکم موجود نہ ہو۔

مستقبل میں پیش آنیوالے واقعات ان پانچ صورتوں میں سے کسی نہ کسی شکل کے ذیل میں آئیں گے:

۱- ایجاب: یعنی شریعت میں اس کے متعلق وجوب کا حکم ہو۔

۲- استحسان: یعنی وہ معاملہ شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ اور مستحسن سمجھا جائے۔

۳- اباحت: مباح ہو۔

۴- کراہت: شریعت کی نظر میں معیوب اور ناپسندیدہ ہو۔

۵- تحریم: قطعی ممنوع اور حرام ہو۔

اس مختصر مباحثہ میں اس کی گنجایش نہیں کہ تیسری خصوصیت کی صحت و ثبوت کے دلائل اور شواہد بیان کیے جائیں، یہ فقہا اور علمائے قانون کا مسلمہ طور پر طے شدہ فیصلہ ہے جو بالکل صحیح ہے

نتیجہ اسلام کے مقاصد اور خصوصیات کی جو تشریح اور وضاحت کی گئی ہے اس سے ہمارا یہ دعویٰ بالکل ثابت ہو جاتا ہے کہ اجتہاد اسلامی قانون کی روح اور اس کا منبع ہے، اور یہ سراسر خلاف عقل بات ہے کہ اجتہاد کے بغیر اسلام کو دائمی اور آخری شریعت اور تمام مسائل و واقعات کا حل قرار دیا جاے۔

علامہ شہرستانی اپنی کتاب الملل والنحل میں تحریر فرماتے ہیں:-

ان الحوادث والوقائع فی العبادات	عبادات اور معاملات میں پیش آنے والے
والتصرفات لاتقبل الحصر و	واقعات بیشمار ہیں، اور یہ قطعی طور سے معلوم ہے کہ

العلم و نعلم قطعا انه لم یرد فی	ہر حادثہ اور معاملہ کا منصوص حکم موجود
کل حادثة نص ولا یتصور	نہیں ہے اور نہ اس کا تصور کیا جاسکتا ہے
ذلك ایضاً (ای لا یمکن) والنصوص	ہر جب نصوص متناہی اور واقعات
اذا کانت متناهیة والوقائع	و مسائل غیر متناہی ہیں اور غیر متناہی کو
غیر متناهیة ومالا یتناهی	متناہی منضبط نہیں کرسکتا تو یقیناً یہ
لا یضبطه ما یتناهی علم قطعاً	معلوم ہو گیا کہ اجتہاد اور قیاس کا لحاظ
ان الاجتهاد والقیاس واجب	کرنا بہت ضروری ہے، یہاں تک کہ
الاعتبار حتی یکون بصدد	ہر نئے مسئلہ میں اجتہاد کیا جائے گا۔
کل حادثة اجتهاد[1]	

اس تشریح و وضاحت کے بعد معلوم ہو گیا کہ اجتہاد کو موقوف سمجھنا ناممکن اور قطعی غلط ہے۔ اسلام اور اس کے ماننے والوں کو ہر زمانہ اور ہر مقام پر مستقل ضرورتوں اور نئی نئی چیزوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور ان کو ایسی دشواریاں پیش آسکتی ہیں جن کا حل تلاش کرنے کے لیے انھیں شریعت کے نصوص اور احکام سے مدد لینا پڑے گی۔

---

[1] علامہ ابن رشد مالکی نے بھی بدایۃ المجتہد کے شروع میں لکھا ہے:

واما ما سکت عنه الشارع من الاحکام فقال	جن احکام کے بارہ میں شارع علیہ السلام نے سکوت اختیار
الجمهور ان طریق الوقوف علیه هو القیاس	فرمایا ہو جمہور کہتے ہیں کہ ان واقفیت کا ذریعہ قیاس ہے
وقال اهل الظاهر القیاس فی الشرع باطل	مگر ظاہریہ اسے باطل سمجھتے اور کہتے ہیں کہ مسکوت عنہ کے
وما سکت عنه الشارع فلا حکم له و دلیل	بارہ میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا مگر عقلاً قیاس بالکل
العقل یشهد بثبوته وذلك ان الوقائع	درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ انسان کے اندر پیش آنے والے
بین اشخاص الاناسی غیر متناهیة والنصوص	واقعات کی کوئی حد نہیں اور نصوص وغیرہ محدود ہیں اور
والافعال والاقرارات متناهیة ومحال	غیر محدود کا محدود سے مقابلہ کرنا محال ہے۔
ان یقابل مالا یتناهی بما یتناهی	"ص"

اجتہاد کے موقوف ہونے کا مطلب تو یہ ہوا کہ اسلامی قانون میں جمود اور تعطل ہے اور وہ زمانہ کے نئے تقاضوں اور موجودہ مسائل اور مشکلات میں شرعی حل پیش کرنے سے عاجز و درماندہ ہے، جو اسکے دوام، ہمہ گیری اور جملہ مشکلات اور حادثات کے حل کی خصوصیات کے بالکل منافی ہے۔

مذکورہ بالا تشریحات کی روشنی میں ہم اجتہاد کے دور کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں،

(۱) زمانہ گذشتہ میں دور اجتہاد ۔ (۲) مستقبل میں دور اجتہاد۔

ادوار کی یہ دونوں قسمیں اپنے مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔

ماضی میں اجتہاد

اجتہاد نے ماضی میں شریعت کی خدمت اور فقہ کو قائم اور باقی رکھنے کا پورا حق ادا کر دیا ہے، یہاں تک کہ اس سے وہ خلا بھی پر ہو گیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے پیدا ہو گیا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے بعد چند سو احکامی آیات اور روایات امت کو عطا فرمائی تھیں، لیکن ان چند نصوص کے اندر اتنی لچک، وسعت، عموم، ہمہ گیری، جامعیت اور تعلیل و توجیہ کی صلاحیتیں اور مستقل اور دائمی قانونی اصول و مبادی تھے، جنھیں فقہ و اجتہاد میں نہایت موزوں اور مناسب بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً قرآن پاک میں ہے:

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ — اے ایمان والو عہدوں کو پورا کرو!

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لا ضرر ولا ضرار — (اسلام میں) ضرر اور ضرار نہیں۔

ضرار کا مطلب یہ ہے کہ ضرر کا بدلہ ضرر سے دیا جائے، مثلاً کسی شخص نے کسی کا مال ضائع کر دیا تو ضائع کرنے والے کو اس کا تاوان دینا ضروری ہوگا نہ کہ اس کے بدلہ میں اس کا مال وہ شخص بھی ضائع کرے جس کا مال اس نے ضائع کیا ہے[1]،

شروع میں تین صدیوں تک عرب اور دوسرے اسلامی ملکوں میں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں

[1] مقالہ نگار نے ان مثالوں کی کوئی تشریح نہیں کی ہے۔ (ض)

بے شمار مجتہدین موجود تھے، اور نصوص کو سمجھنے، احکام و مسائل کو مستنبط کرنے اور نئے حالات و واقعات کو ان پر منطبق کرنے کے بارہ میں ہر مجتہد کے اصول جدا اور طریقے مختلف تھے۔ بعض اصولوں پر سب مجتہد متفق بھی ہوتے تھے، اس لیے شروع کی تین صدیوں میں مجتہدین کی کثیر تعداد کے مطابق متعدد اجتہادی مذاہب پیدا ہو گئے تھے، کیونکہ ہر مجتہد اور فقیہ جملہ مسائل میں اپنے فقہی آراء سے ایک مستقل مذہب قائم کر دیتا تھا، اور ہر مذہب تمام مسائل و مباحث میں ایک مکمل اور جامع شرعی قانون ہوتا تھا۔ ان میں سے کچھ مذاہب تو اپنے بانیوں کے ساتھ ہی ختم ہو گئے اور اختلاف فقہ کی کتابوں میں صرف کچھ ان کی متفرق چیزیں باقی رہ گئی ہیں، مگر کچھ اہل مذاہب کے تلامذہ کو توفیق ہوئی، انھوں نے اپنے ائمہ کے منقولات اور اقوال کو محفوظ، مدون اور شائع کر دیا جس کو بعد کے لوگوں نے اختیار کیا اس لیے وہ زندہ رہ گئے۔ ان ہی لوگوں نے موجودہ چار مذاہب کی مستقل خدمت و ترقی اور ترویج و اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔

ان چاروں مذاہب کی مستقل حیثیت، ان کی جامعیت اور فقہی کتابوں کی کثرت کی وجہ سے رفتہ رفتہ شرعی اور لغوی علوم میں جو اجتہاد کی صلاحیت اور استعداد پیدا کرنے کے لیے ضروری تھے رسوخ اور مہارت کم اور ختم ہوتی گئی، مگر ان مذاہب کے مقلدین کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا، اور عباسی حکومت کے دور عروج میں عالم اسلامی کے ہر خطہ اور گوشہ میں ان میں سے کسی ایک مذہب کی سیادت و قیادت کا سکہ بیٹھ گیا، اور وہاں اس کے قاضی و مفتی ہونے لگے۔

پھر ان مذاہب کے اکابر علماء اور متبعین کے ہاتھوں متعدد تفریعات و استنباطات اور تالیفات وجود میں آئیں اور متبعین مذاہب نے یہ متفقہ فیصلہ کر دیا کہ یہ مذاہب فقہی ضروریات کے لیے کافی اور وافی ہیں اور چونکہ اجتہاد مطلق کی استعداد اب شاذ اور معدوم ہو چکی ہے اور اندیشہ ہے کہ جمہور امت کی قوت ممیزہ کی کمزوری اور اجتہاد کی حقیقی استعداد و صلاحیت کے فقدان سے فائدہ اٹھا کر کوئی نااہل شخص اجتہاد کا مدعی بن جائے اور اس کے فریب میں آکر لوگوں کا دین برباد ہو جائے، اس لیے پیروان مذاہب نے چوتھی صدی ہجری

کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کا فتوی دیدیا،

مگر ان مذاہب کے اصول کے اندر مقید اجتہاد برابر جاری رہا اور بڑے بڑے پیروان مذاہب نے اپنے اپنے زمانہ میں نئے حالات اور مسائل میں اپنے اپنے مذاہب کے اصول کے مطابق قیاس، استحسان یا مصالح مرسلہ کو سند اور بنیاد قرار دے کر اجتہاد کرتے اور ان کا حل تلاش کرتے رہے۔

اسی اصول پر حنفی مذہب میں پانچویں صدی ہجری میں سود کی شکل سے بچنے کے لیے بیع وفا[1] کے احکام کی بنیاد رکھی گئی اور متاخرین فقہا نے اسی اصول پر وقف اور ان دوسرے تصرفات کے عدم نفاذ کا فتوی دیا ہے جو مقروض کے سارے قرض کو شامل ہونے کی بنا پر اسے اس کے قرض سے بچا دینے والے ہوں بجز اس صورت کے جس میں قرض دینے والا راضی ہو۔ اور یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا کہ مقروض وقف یا ہبہ وغیرہ کو قرض نہ دینے کا بہانہ بنا کر قرض دینے والے کا مال ہڑپ اور اپنا مال بچانے کا ذریعہ نہ بنا سکے۔

مگر یہ مذہب کے اندر یہ مقید اجتہاد بھی رفتہ رفتہ کمزور اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ کم ہوتا گیا اور یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ فقہ اسلامی بالکل بانجھ ہو کر رہ گئی، اور کوئی نئی چیز پیش کرنے سے بالکل عاجز اور درماندہ ہو گئی، اور اب یہ حال ہو گیا ہے کہ محض حفظ و تکرار ہی اصل اور مقصود بن گیا ہے، اور جن لوگوں کو علما اور فقہا کا نام دیا جاتا ہے ان میں بہتیرے فقہی اسباق میں مذہبی آرا و احکام کے متعلق دلائل و شواہد کی بحث و جستجو کو معیوب اور قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔

ان مختصر تاریخی اشارات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اجتہاد شریعت کی روح اور غایت ہے، اور جس کے بغیر وہ مفلوج اور معطل ہو گئی ہے۔

اس افسوسناک صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ دولت عثمانیہ کے آخری زمانہ سے اب تک کے اسلامی ملکوں کے سربراہ اور حکام یہ سمجھنے لگے ہیں کہ شریعت محمدی اور فقہ اسلامی کے اندر موجودہ ضرورتوں اور تبدیلیوں کے اصلاح و درستگی کا کوئی سامان نہیں، اس لیے وہ غیر اسلامی قوانین اختیار کر رہے ہیں جن نے

[1] یہ بیع وفا کا حکم ہے۔ فتاوی قاضی خان میں فیما یکون فرارا عن الربا کے عنوان سے اسکا ذکر اور شکل موجود ہے، ج ۲ ص ۵۱۲ (ض)

آخر کار فقہ اسلامی کو علمی اور عملی دونوں اعتبار سے دفن کر کے رکھ دیا۔

اسکا آغاز علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں ہو چکا تھا، چنانچہ انھوں نے اس موضوع پر اپنی دو کتابوں "الطرق الحکمیۃ" اور "اعلام الموقعین" میں نہایت عمدہ اور لطیف بحث کی ہے اور مقلدین اور پیروان مذاہب کے جمود و تعطل اور سرچشمۂ شریعت کو تنگ اور مسدود کر دینے پر سخت ماتم اور قلق کا اظہار کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان ہی لوگوں نے امرا اور سلاطین کو اپنے زمانہ کے مطابق نئے نئے غیر اسلامی قوانین و احکام بنانے کا موقع دیا اور اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا کہ فقہ اسلامی موجودہ مسائل حل کرنے سے قاصر اور عاجز ہے حالانکہ خدا کے آسان اور سہل قانون میں کوئی دشواری اور تنگی نہ تھی، بلکہ ساری خرابی اور کمی مقلدین اور پیروان مذاہب کے عقل و مذاق کی ہے۔

اس تفصیل سے غور و فکر کرنے والے کو معلوم ہو سکتا ہے کہ اجتہاد کو ختم کرنے کے بعد امت کو سخت مصیبت میں گرفتار ہو جانا پڑا، حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص کو قطعاً اسے ختم کرنے کا حق اور اختیار نہ تھا جب کہ اسلام کی خصوصیات علیٰ حالہ باقی تھیں اور باقی رہیں گی۔

ان چاروں مذاہب کے روشن خیال متاخرین بھی اپنی کتابوں میں تصریح کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص علمی اعتبار سے مرتبۂ اجتہاد کو پہنچ جائے اور اس میں اس کی شرطیں اور صلاحیتیں وغیرہ بدرجۂ کمال پائی جائیں تو اس کے لیے کسی خاص مذہب کی تقلید اور پیروی جائز نہیں، مگر عملاً وہ اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ کوئی شخص اس درجہ اور کمال کو حاصل کر سکتا ہے۔ تاہم اس سے یہ تو ثابت ہی ہو جاتا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھولنا ممنوع نہیں ہے، البتہ دشواری یہ ہے کہ اس کی کلید مفقود ہو گئی ہے، ساتویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ علامہ عزالدین بن عبد السلام شافعی فرماتے ہیں:-

اختلفوا فی انسداد باب الاجتہاد علی اقوال :... وکلھا اقوال فاسدۃ	اجتہاد کے انسداد کے بارہ میں لوگوں کے مختلف اقوال ہیں ...... مگر وہ سب فاسد ہیں، کیونکہ اگر کوئی

فانه ان وقعت حادثة غیر منصوصة	غیر منصوص واقعہ پیش آئے یا کوئی ایسا
او فیها خلاف بین السلف فلا	معاملہ ہو جس میں سلف کا اختلاف ہو تو ہمیں
بد فیها من الاجتهاد من کتاب	کتاب و سنت کی روشنی میں اجتہاد کرنا
او سنة وما یقول سوی هذا	ناگزیر ہو جائے گا۔ اس کے خلاف جو کچھ
الا صاحب هذیان[1]	کہا جاتا ہے وہ سب ہذیان ہے۔

اگر ہم اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کے بجائے اسے صرف موقوف کرنے ہی پر اکتفا کریں جب بھی صحیح فیصلہ کرنے کے لیے ایک ایسی تجزیاتی نظر ڈالنی ضروری ہے، جو ہمارے سامنے ماضی میں اجتہاد کے مزاج و طبیعت کو ظاہر کردے۔

ماضی میں اجتہاد کا مزاج

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اجتہاد کا مزاج شورائی ہو گیا تھا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اور ان کے بعد حضرت عمرؓ نے سیاسی، تمدنی اور معاشرتی احکام اور مسائل کا شرعی حل دریافت کرنے کے لیے صحابہ کرام کو جمع کرتے اور ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھاتے۔ اور یہ طریقہ کتاب و سنت کے بالکل مطابق ہے، کیونکہ قرآن میں شوریٰ کا جو حکم دیا گیا ہے وہ مطلق عام اور تمام معاملات کو شامل ہے، اور سنت سے اس کی تائید اس طرح ہوتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ "اگر کتاب و سنت میں کسی حکم کے متعلق تصریح موجود نہ ہو تو مسلمان کیا کریں"؟ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ

اجمعوا له العالمین ولا تقضوا	علماء (جنھیں اس کے متعلق پوری واقفیت ہو)
فیه برأی واحد	کو جمع کرو اور صرف ایک شخص کی رائے کے مطابق۔

لیکن اس کے بعد اجتہاد کے مزاج کی یہ خصوصیت نہ رہی، کیونکہ صحابہ اور تابعین دور دراز ملکوں اور

[1] بحوالہ رسالہ اجتہاد و تقلید الاستاذ عبدالوہاب خلاف ص ۱۶

شہروں میں پھیل گئے تھے، اور ان سب کا جمع ہو کر کسی معاملہ کو باہم رائے و مشورہ سے طے کرنا دشوار ہو گیا تھا اس لیے ہر مجتہد اپنی فہم و رائے میں ایک مستقل حیثیت رکھتا تھا، اور اسی کے مطابق وہ اجتہاد کرتا تھا اسلیے اجتہاد انفرادی مزاج کا حامل بن گیا اور اس کا شورائی مزاج ختم ہو گیا۔

شروع میں لوگ اسلام کے ابتدائی عہد سے قریب تھے، اور ان کے دلوں میں اس کا اثر تازہ تھا، اور تیسری صدی میں روایت حدیث کا بڑا چرچا ہو چکا تھا، اور اکثر لوگ قرآن و حدیث اور عربی زبان سیکھنے اور فقہی بصیرت حاصل کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش میں رہتے، اور حصول علم کے لیے اپنی ساری عمر ختم کر دیتے تھے، ایسے مبارک زمانہ میں ثقہ اور متورع علماء کا امتیاز آسان تھا، مگر جوں جوں لوگ عہد نبوی سے جو اسلام کا درخشن اور تابناک دور ہے دور ہوتے گئے، حقیقی اور غیر حقیقی علماء کا امتیاز ختم ہوتا گیا اور تقویٰ و تدین میں کمی آنے لگی، اس لیے چوتھی صدی ہجری میں مذاہب اربعہ کے اتباع اور مقلدین کو اندیشہ پیدا ہوا کہ مبادا ایسے لوگ نہ اجتہاد کرنے لگیں جن کا مقصد بدعتوں کی ترویج اور اپنے زہریلے افکار کی اشاعت اور اصول شریعت کو مسخ کرنا اور بگاڑنا ہو، اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مستقل مذاہب کے فروع اور جزئیات میں مسائل و ضروریات کے حل کا پورا سامان موجود ہے، اسلیے انھوں نے اجتہاد کے دروازہ کے بند کیے جانے کا فتویٰ دیدیا۔

ماضی میں اجتہاد کے مزاج کی اس تحلیل و تجزیہ کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ انفرادی اجتہاد نے فقہ اسلامی کی تاسیس کی ابتدا میں ان قدیم مجتہدین کے بدولت امت پر بڑا احسان اور اسے مسائل سے مالامال کیا، عزائم میں جان ڈالی، قوی کوششی و کوشش اور استنباط کا خوگر بنایا، اساطین علم و فن میں نصوص اور اصول شرع کے مطابق قواعد مستنبط کرنے اور قانونی نظریات کی تشکیل و تاسیس میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کا جذبہ پیدا کیا، یہانتک کہ اسلامی فقہ خوب بار آور ہوئی اور اس کے ذخیرہ میں اتنا اضافہ ہو گیا کہ آج تک لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، یہ ایک ایسا شاندار کارنامہ ہے کہ دوسری قومیں اسکی نظیر نہیں پیش کر سکتیں، لیکن کیا انفرادی اجتہاد کے بغیر جو تیسری صدی ہجری میں رائج تھا، یہ سب کچھ وجود میں آگیا؟ اس کے بعد خیر و برکت اور حکمت و دانشمندی کا دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ

انفرادی اجتہاد کو اس اندیشہ سے بند کر دیا گیا کہ اس سے انتشار اور انارکی پیدا ہو جاتی، مگر اس میں سخت غلطی یہ ہوئی کہ اسے اس طرح مطلقاً موقوف کر دیا گیا کہ شریعت اور فقہ اسلامی میں جمود اور تعطل آگیا اور وہ زمانہ کے نئے تقاضے اور مطالبات پورا کرنے سے عاجز ہو گئی، اور اس کی قوت عمل ختم اور سرچشمۂ زندگی خشک ہو گیا، حالانکہ انتشار اور پراگندگی کا علاج یہ نہ تھا کہ اجتہاد کو حرام قرار دیدیا جائے بلکہ اس کی تنظیم کر کے اس کو افراد کے بجائے جماعت کے قبضہ و اختیار میں دیدینا چاہیے تھا، اسی اصول پر مستقبل میں اجتہاد کو اپنا فرض انجام دینا ہے۔

مستقبل میں اجتہاد اجتہاد کے بارہ میں ماضی کی غلطی ہمارے سامنے آچکی ہے، اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں اجتہاد کی کیا شکل ہو سکتی ہے؟

ماضی میں انفرادی اجتہاد کی ضرورت تھی، مگر آج وہ سخت خطرناک بن چکا ہے، چوتھی صدی ہجری میں جن باتوں کے اندیشہ کی بنا پر اجتہاد کا دروازہ فقہائے مذاہب نے بند کر دیا تھا، وہ اب بالکل متیقن اور قطعی بن گیا ہے دین سے سودا بازی کرنے والوں کی تعداد معتد بہ ہے اور ان میں سے اکثر علم اور تقریر و تحریر کی قوت میں علمائے صالحین اور اتقیا سے بڑھ کر ہیں، جامع ازہر کے فضلا نے ایسی کتابیں اور فتاوے شائع کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنا علم دشمنان اسلام کے ہاتھوں میں گرو رکھدیا ہے۔ اور وہ اسلام کی بنیادیں اس طرح ڈھا دینا چاہتے ہیں جس طرح دشمن بھی نہیں ڈھا سکتے تھے، اس قسم کے لوگوں کا دین سے کیا تعلق ہو سکتا ہے، یہ تو منافق اور سازشی قسم کے لوگ ہیں جو اجتہاد، آزادی رائے اور حریت فکر کے پردے میں دین کے ساتھ خیانت اور مذاق کر رہے ہیں، اور اس سازش اور خیانت کا انھیں بڑا معاوضہ مل رہا ہے اور خدا کی لعنت سے بے پروا ہو کر بڑے بڑے دنیوی منافع حاصل کر رہے ہیں،

بس اگر ہمیں اجتہاد کے ذریعہ جس کا دائمی اور ہمیشہ کے لیے ضروری ہونا شرعاً ثابت ہے، امت کی نشأۃ ثانیہ اور اسلامی قانون میں نئے سرے سے روح اور قوت پیدا کرنی ہے اور یقیناً اسی طریقہ سے موجودہ زمانہ کی بے شمار مشکلات اور دشواریوں کا معقول، شکوک و شبہات اور عیوب سے پاک شرعی حل ہو سکتا ہے۔ اور اسی سے جامد و معاندانہ تعطل پسند اور تجدد و نواز ہر قسم کے افکار و نظریات کا استیصال ہو سکتا ہے، اس کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اجتہاد کے لیے ایک نیا اسلوب اور طریقہ کار اختیار کیا جائے اور وہ انفرادی کے بجائے اجتماعی اجتہاد ہو، اس طریقہ سے ہم اجتہاد کو اس کے اس اولین مقام پر لیجا سکتے ہیں جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں تھا،

اس کی صورت یہ ہوگی کہ علمی، ادبی اور لسانی انجمنوں کی طرح قانون اسلامی کے لیے بھی ایک اکاڈیمی قائم کی جائے اور اس میں ہر شہر کے ایسے علما اور ماہرین قانون کو شامل کیا جائے جو علوم شرعیہ میں پوری مہارت رکھنے کے ساتھ عہد جدید کے تقاضوں سے باخبر، سیرت و کردار میں ممتاز اور صلاح و تقویٰ کے اعتبار سے بلند ہوں، اور اس اکاڈیمی سے ان علما اور معتبر اشخاص کو بھی وابستہ کیا جائے جو موجودہ دور کے مختلف فنون مثلاً معاشیات، اجتماعیات، سیاسیات، تمدن اور قانون وغیرہ میں سے کسی ایک میں مخصوص امتیازی حیثیت رکھتے ہوں تاکہ اپنے اپنے فن کے متعلق صحیح معلومات دے سکیں، اور ان خاص فنون کے سلسلہ میں علمائے مجتہدین ان پر اعتماد و اعتبار کر سکیں۔

اس اکیڈمی کے تمام ممبروں کو صرف اسی کام سے سروکار رہنا چاہیے اور ان کے پاس وسیع کتب خانہ ہونا چاہیے۔ ان کی تنخواہیں معقول ہوں اور جن مضامین، مباحث اور مشکلات زمانہ کے بارہ میں بحث و تحقیق کی ضرورت ہو ان میں اجتہادی درس و تدریس کی صلاحیت رکھتے اور اسلامی احکام کو پرزور طریقہ سے ثابت کر سکتے ہوں، اور اس بحث و تفتیش کے لیے رسالہ جاری کر سکتے ہوں، قانونی انسائیکلوپیڈیا کے طرز پر حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق فقہ اسلامی کی انسائیکلوپیڈیا تیار اور مختلف مذاہب فقہ کی اہم کتب کی نئی ابجدی فہرستیں تیار کر سکتے ہوں تاکہ بحث و تحقیق کرنے والے کو مراجعت کرنے میں آسانی ہو، اس طرح کے دوسرے فقہی خدمات جن کی عہد حاضر کو اجتہاد کے نقطۂ نظر سے سخت ضرورت انجام دے سکتے ہوں۔

اس تجویز پر کافی غور و خوض اور موازنہ و مقابلہ کی ضرورت ہے، مندرجہ ذیل دونوں طریقوں میں کسی ایک ہے

باطمینان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) یا تو تمام اسلامی جماعتوں سے اس کے لیے چندہ جمع کیا جائے مگر یہ صورت اس وقت تقریباً ناممکن ہے۔ اس لیے کہ عام مسلمانوں کے پاس سرمایہ کی کمی ہے اور وہ معاشی مشکلات میں مبتلا ہیں، اور متمدن قسم کے لوگوں کو اسلام سے بہت کم رغبت باقی رہ گئی ہے۔

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ کوئی یا کئی اسلامی سلطنتیں اس کام کو اپنے ذمہ لے لیں اور اس کے لیے ضروری سرمایہ فراہم کریں۔

اس طرح کی قانونی اکیڈمی قائم کرنے کی تجویز پاکستان کے دارالسلطنت کراچی میں منعقد ہونے والی دو اسلامی کانفرنسوں (۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۱ء) میں طے ہو چکی ہے، میں ان میں شریک تھا لیکن اس تجویز کو عملاً نافذ کرنے میں دشواریاں حائل ہوگئیں، اس لیے وہ کاغذ ہی کی زینت بن کے رہ گئی، یہ بڑی دردناک حقیقت ہے کہ اسلامی حکومتیں اسلام کے علاوہ ہر راہ میں مال خرچ کرنے میں بڑی فیاض ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فلولا نفر من کل فرقۃ طائفۃ	کیوں نہ ہر فرقہ میں سے ان کے کچھ لوگ
لیتفقھوا فی الدین ولینذروا	نکلے تاکہ دین میں فقہ و بصیرت پیدا کریں
قومھم اذا رجعوا الیھم	اور اپنی قوم کو واپس آکر آگاہ کر سکیں
لعلھم یحذرون	تاکہ وہ بھی بچ سکیں

رسالہ جامعہ شائع ہوگیا

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ماہنامہ رسالہ جامعہ دوبارہ جاری کیا گیا ہے، اس دور جدید میں بھی اس کی تمام سابقہ خصوصیات قائم رکھی گئی ہیں۔

سالانہ چندہ چھ روپے ۔ نمونہ کا پرچہ دس نئے پیسے

ملنے کا پتہ: جامعہ۔ ڈاک خانہ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔

مکتوب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پیرس

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اس خط میں قاضی رشید کے بارہ میں جس التباس کا اظہار کیا ہے اس کی تحقیق کی جانب قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کو توجہ دلائی ہے، اتفاق سے قاضی صاحب اس خط کی اشاعت سے پہلے ہی اس کے متعلق اپنی تحقیق لکھ چکے تھے جس کو اس خط کے ساتھ ہی اس نمبر میں شائع کیا جا رہا ہے۔ "م"

اتوار، ۱۲ ربیع الانور ۱۴۰۸ھ پاریس

مخدوم و محترم ۔ سلام مسنون

رسالہ معارف کی جلد (۸۵) میں فاضل محترم اطہر مبارکپوری نے مسلسل دو قسطوں میں "عرب ہند کے قدیم علمی و ثقافتی تعلقات" کے عنوان سے جدید دریافت و شائع شدہ نادر کتاب الذخائر و التحف للقاضی الرشید بن الزبیر پر تبصرہ فرمایا اور اقتباسات کا ترجمہ کیا ہے، فاضل مقالہ نگار کی دو چیزوں پر کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

وہ لکھتے ہیں کہ القاضی الرشید نامعروف نہیں ہے، بلکہ محترم پروفیسر عبد العزیز میمنی صاحب نے اس کا حال کئی کتابوں میں پایا ہے، قصہ یہ ہے کہ ابن خلکان اور یاقوت نے جس القاضی الرشید کا ذکر کیا ہے اس کی وفات ۵۶۲ھ یا ۵۶۳ھ میں ہوئی ہے اور ہماری کتاب کی اندرونی شہادت یہ ہے کہ اس کا مولف اس سے تقریباً ایک صدی قبل فوت ہو چکا ہے، ابن خلکان میں القاضی الرشید بن القاضی الرشید بن القاضی الرشید کا ذکر ہے، میرا گمان ہے کہ ہماری کتاب پوتے کی نہیں بلکہ دادا کی ہے (لیکن دادا کے حالات نہیں ملتے) کتاب میں میرے دیباچے کے الفاظ کا یہی منشا ہے۔

اسی طرح وہ راجہ دھمی یا دہمی پر قطعی فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ اسے کیا پڑھنا چاہیے اور وہ کون ہے، میں نے بکثرت تحقیقی مقالوں کے حوالے دیے ہیں کہ وہ فضلا بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے اور نہیں بتا سکے کہ اس معرب لفظ کی اصل کیا ہے اور اس کا کس تاریخی شخص پر اطلاق ہونا چاہیے؟ اگر محترم مبارکپوری صاحب ان سارے مقالوں کو پڑھ کر

ان کے دلائل کی تنقید کرکے کوئی فیصلہ صادر فرمائیں تو علم کی بڑی خدمت ہوگی، اور ایک دیرینہ بحث ختم ہوسکے گی۔ ظاہر ہے کہ محض دعویٰ کافی نہیں، دلائل کی ضرورت ہے۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے ایک بارہ تحریر کی مجھے حال میں کترن ملی ہے۔ مخدوم محترم فراتے ہیں کہ مجھ ناچیز کی فرانسی سیرت نبویہ کا اردو ترجمہ ہونا چاہیے۔ یہ میری عزت افزائی ہے، لیکن ناظرین معارف سے عرض ہے کہ (۱) اگر مولف اپنی تحریروں کا ترجمہ بھی خود کرنے لگے تو اسی کے تکمیل طلب اور تدوینی شدنی کاموں کو کون تمام کرے؟ یوں بھی (۲) اس کتاب کا بڑا حصہ میرے ان مضامین کی نظر ثانی پر مشتمل ہے جو معارف وغیرہ میں چھپے ہیں اور پھر "عہد نبوی کا نظام حکمرانی" اور "رسول اکرم کی سیاسی زندگی" نامی کتابوں میں داخل ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں نظر ثانی و ترمیم بھی ہوئی ہے اور بعض نئے ابواب کا بھی اضافہ ہوا ہے، مثلاً فینانس، نظام فوج، ارتقاء سرحدات، مملکت و تقسیم صوبہ جات و اضلاع وغیرہ۔ کتاب بڑی تقطیع کے کوئی آٹھ سو صفحوں میں چھپی ہے۔ اس ضخیم ترجمے کے کام کو ہرحال کوئی انجام دینا چاہے تو میں یہ مدد ضرور دے سکتا ہوں کہ (بشرط حیات و صحت) ترجمے کی نظر ثانی کرکے یہ بتا سکوں کہ آیا کہیں مضمون سمجھنے میں کوئی غلطی تو نہیں ہوئی ہے۔ ویسے متعدد تالیفوں کا کام فی الوقت جاری ہے اور ان کو چھوڑ کر ترجمے میں لگنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔

آخر میں یہ عرض ہے کہ چند سال قبل رسالۂ معارف نے مجھ سے پوچھا تھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانے کے نسخۂ قرآن کی موجودگی کی کیا حقیقت ہے؟ اس پر میرا جواب بھی چھپا تھا کہ اس کا عکس لیکر نادر روسی نے چھاپا تھا، اب اسکی کچھ مزید تفصیلیں بھی ملی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس کا نسخہ برٹش میوزیم میں نہیں (جیسا کہ میں نے لکھا تھا) بلکہ ڈرہام یونیورسٹی میں ہے، میں نے اس کا میکرو فلم منگایا ہے، اگر آئے تو انشاء اللہ کچھ تفصیل آیندہ عرض کرسکوں گا۔

موتمر مستشرقین ماسکو پر ایک تبصرہ ارسال خدمت ہے۔ فقط

نیازمند
محمد حمید اللہ

قاضی رشید بن زبیر غسّانی اسوانی مصری

متوفی محرم ۵۶۳ھ

از

مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی

اپریل اور مئی ۱۹۶۰ء کے معارف میں راقم الحروف کا ایک مقالہ بعنوان "ہند و عرب کے قدیم علمی اور ثقافتی تعلقات" شائع ہوا تھا، جو قاضی رشید بن زبیر کی کتاب الذخائر والتحف سے ماخوذ تھا، اس کے شروع میں ہم نے لکھا تھا:

"اور چونکہ ڈاکٹر احمید اللہ صاحب حیدرآبادی (فرنساوی) صاحب کو ان کا مفصل تذکرہ کہیں نہیں مل سکا اس لیے کتاب الذخائر والتحف کے مختلف مقامات سے مصنف کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے، جو نہایت مختصر اور نامکمل ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر لکھا ہے: وأما القاضی الرشید (او المهذب) ابو الحسین احمد بن رشید بن القاضی الزبیر المذکور عند الغزولی والمقریزی فلم نعثر علی ترجمته فی الکتب المتداولة ولکن الشهادة الداخلیة تخبرنا عن عصره وبعض احواله۔

اس کے بعد موصوف نے کتاب الذخائر والتحف سے چند عبارتیں نقل کی ہیں، اور ان سے نتیجہ نکالا ہے کہ قاضی رشید بن زبیر پانچویں صدی ہجری میں گذرے ہیں۔

نیز ڈاکٹر صاحب نے مقریزی کی کتاب الخطط کی ایک عبارت عن القاضی المهذب ابن الزبیر

کو نقل کر کے لکھا ہے و فی رأینا ان کلمة المهذب فی ذکر القاضی المهذب ابن الزبیر صفة
دلیس بعلم (ص ۱۲) اس طرح ڈاکٹر صاحب نے قاضی رشید بن زبیر اور قاضی مہذب بن زبیر کو ایک ہی شخص
مانا ہے، جیسا کہ ان کی اوپر کی عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے، حالانکہ قاضی رشید بن زبیر متوفی محرم ۵۶۳ھ
چھٹی صدی ہجری میں گذرے ہیں اور قاضی مہذب بن زبیر ان کے حقیقی بھائی ہیں۔

علامہ ابن خلکان نے ان دونوں بھائیوں کا تذکرہ وفیات الاعیان میں کیا ہے اور قاضی رشید ابن زبیر کے تفصیلی ذکر میں ان کے بھائی قاضی مہذب بن زبیر کا ضمنی تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ قاضی رشید بن زبیر کا تذکرہ مشہور محدث حافظ ابو طاہر سلفی نے اپنی بعض تعلیقات میں اور کاتب عماد نے کتاب السیل اور ذیل میں کیا ہے،

قاضی رشید کے یہ دونوں سوانح نگار ان کے ہمعصر اور انکی وفات کے بعد ان کی وفات ہوئی ہے۔

حافظ ابو طاہر سلفی (صدر الدین احمد بن محمد بن احمد بن محمد بن ابراہیم سلیفہ) اصفہانی شافعی مشہور حافظ حدیث ہیں، ذیقعدہ ۵۱۱ھ میں ثغر اسکندریہ گئے اور وہاں اقامت اختیار کی، دور دور سے لوگ ان کے پاس آکر حدیث کا سماع کرتے تھے، ان کے امالی اور تعلیقات بہت مشہور ہیں، جن میں انھوں نے قاضی رشید بن زبیر کا بھی تذکرہ کیا ہے، اصفہان میں ۴۷۲ھ میں پیدا ہوئے اور ثغر اسکندریہ میں ۵ ربیع الآخر ۵۷۶ھ میں وفات پائی،[۱] ان کے معاصر قاضی رشید بن زبیر ۵۶۳ھ میں مصر میں فوت ہوئے اور ۵۵۹ھ میں ثغر اسکندریہ میں دواوین سلطانیہ کے نگراں مقرر کیے گئے تھے، جیسا کہ آیندہ حافظ سلفی کے بیان سے معلوم ہوگا۔

اور عماد الدین الکاتب نے (محمد بن صفی الدین ابو الفرج محمد بن نفیس الدین ابو الرجا حامد بن محمد بن عبد اللہ) بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کی، خلافیات اور ادبی علوم و فنون

[۱] ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲ ملاحظہ ہو۔

میں یکتا، شاعری اور انشاء پردازی میں یگانہ تھے، سلطان نور الدین زنگی کے دربار سے متوسل ہوگئے، اور سلطان صلاح الدین اور امیر شیرکوہ کے ساتھ اس دور کے انقلابات میں حصہ لیا، اسی زمانہ میں مصر میں قاضی رشید بن زبیر بھی تھے، عماد الدین نے ابو المعالی سعد بن علی قذانی خیطری کی کتاب زینة دمیة الدہر کا ایک ذیل خریدة القصر و جریدة العصر کے نام سے لکھا ہے اسی ذیل میں قاضی رشید بن زبیر کا تذکرہ کیا ہے ان کی ولادت ۵۱۹ھ میں اصفہان میں اور وفات رمضان ۵۹۷ھ میں دمشق میں ہوئی ہے[۱]

قاضی رشید بن زبیر کے ان دونوں معاصروں نے ان کا اور ان کے بھائی قاضی مہذب بن زبیر کا تذکرہ کیا ہے اور ان ہی دونوں کے حوالے سے علامہ ابن خلکان نے نقل کیا ہے، قاضی رشید کا نام احمد ہے، مگر ان کے دادا کے وقت سے نام کے ساتھ رشید کی صفت ملتی ہے، چنانچہ بیٹا باپ اور دادا تینوں قاضی اور رشید کے لقب سے مشہور ہوئے، چھٹی پشت میں زبیر نامی ان کے مورث اعلیٰ ہیں، نسبی تعلق قبیلہ غسان سے اور وطن مصر کا مشہور شہر اسوان تھا، ڈاکٹر صاحب نے ان کا مسقط الرأس کرمان بتایا ہے، حالانکہ کرمان سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے،

ابن خلکان نے ان کے ترجمہ میں جو ابتدائی عبارت لکھی ہے اس سے یہ تمام باتیں معلوم ہوجاتی ہیں، وہ لکھتے ہیں، القاضی الرشید ابو الحسین احمد بن القاضی الرشید ابی الحسن علی بن القاضی الرشید ابی اسحاق ابراهیم بن محمد بن الحسین بن الزبیر الغسانی الاسوانی[۲]

پھر لکھتے ہیں:-

کان من اهل الفضل والنباهه	قاضی رشید فضل و شرافت اور عزت و شہرت
والریاسة، صنف کتاب الجنان	کے مالک تھے، انھوں نے کتاب الجنان و
ریاض الاذهان، وذکر فیه	ریاض الاذہان نامی کتاب لکھی ہے جس میں
جماعة من مشاهیر الفضلاء	مشاہیر فضلاء کے حالات لکھے، اور اس کے

[۱] تفصیل کے لئے ابن خلکان جلد ۲ ص ۱۸۸ تا ۱۹۱ ملاحظہ ہو [۲] ابن خلکان جلد دل ص ۳۲ طبع ایران قدیم

وله ديوان شعر — اشعار کا ایک دیوان بھی ہے۔

پھر لکھتے ہیں کہ ان کے بھائی قاضی مہذب ابو محمد حسن کا بھی شعروں کا ایک دیوان ہے۔ یہ دونوں بھائی نظم ونثر میں طرزِ خاص کے مالک تھے۔ پھر قاضی مہذب کے ایک قصیدہ کے ۱۶ اشعار اور دوسرے قصیدہ کا ایک شعر نقل کرکے لکھا ہے کہ ان کے تمام اشعار اچھے ہیں، انھوں نے سب سے پہلا شعر ۵۲۶ھ میں کہا۔ عماد کاتب نے ان کا تذکرہ کتاب السیل اور اپنے ذیل میں کیا ہے۔ یہ اپنے بھائی رشید سے زیادہ بلند پایہ شاعر ہیں اور رشید ان کے مقابلہ میں تمام علوم کے عالم ہیں۔

قاضی مہذب قاہرہ میں رجب ۵۶۱ھ میں فوت ہوئے، یعنی قاضی رشید سے تقریباً دو سال پہلے ان کے بھائی قاضی مہذب کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد ابن خلکان لکھتے ہیں کہ قاضی رشید کا تذکرہ حافظ ابو طاہر سلفی نے اپنے بعض تعلیقات میں کیا ہے، اور لکھا ہے کہ قاضی رشید اپنے منشا اور پسند کے خلاف ۵۵۹ھ میں ثغر اسکندریہ میں شاہی دفاتر کے نگراں مقرر کیے گئے، اور محرم ۵۶۳ھ میں ظلم وزیادتی سے قتل کر دیے گئے۔

پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ حافظ ابو طاہر سلفی ذی قعدہ ۵۱۱ھ میں ثغر اسکندریہ گئے اور مدت العمر وہیں رہ کر ربیع الآخر ۵۷۶ھ میں فوت ہوئے، اس سے معلوم ہوا کہ قاضی رشید کے ثغر اسکندریہ میں شاہی دفاتر کے نگراں بنائے جانے کا واقعہ حافظ سلفی کی موجودگی میں ہوا، اس لیے یہ شاہد عینی کی شہادت ہے۔

آگے چل کر علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ عماد نے بھی قاضی رشید کا ذکر کتاب السیل میں اور خریدہ کے ذیل میں ان الفاظ میں کیا ہے:-

الخضم الزاخر والبحر العباب — یہ علم کا بحر بے پایاں تھے، میں نے ان کا اور ان کے
ذكرته في الخريدة واخاه المهذب — بھائی مہذب کا ذکر اپنی کتاب خریدہ میں کیا ہے
قتله شاور ظلماً لميله الى اسد — ان کو شاور نے ۵۶۳ھ میں ایسے قتل کیا ہے کہ
الدين شيركوه في سنة ثلاث وستين — یہ اسد الدین شیرکوہ کے خیرخواہ تھے، رنگ

وخمسمائة. كان اسود الجلد و — سیاہ تھا، شہر اسوان میں سرداری کا درجہ
سيد البلد، اوحد عصره في — حاصل تھا، ہندسہ، ریاضی اور شرعی علوم
علم الهندسة والرياضيات — وآداب میں اپنے زمانہ میں یکتا تھے۔
والعلوم الشرعيات والآداب
الشعريات.

اس کے بعد عماد نے امیر عضد الدین ابوالفوارس مرہف بن اسامہ کی روایت سے قاضی رشید کے پانچ اشعار نقل کیے ہیں،

پھر عماد کاتب کی کتاب الخریدہ سے شاور کے بارہ میں ان کے دو اور تین دوسرے اشعار نقل کیے ہیں، عماد سے محدث علیمی یمنی نے بغداد میں ۵۵۱ھ میں بیان کیا تھا کہ قاضی رشید نے اپنے یہ اشعار مجھے سنائے تھے، اور ابن طلیس بن حباب کے تین اشعار درج کیے ہیں جو اس نے قاضی رشید کے پاس لکھ بھیجے تھے، پھر چند اشعار ابوالفتح محمود کاتب کے درج کیے ہیں، جن میں قاضی رشید کے سیاہ رنگ کا مذاق اڑایا گیا تھا،

قاضی رشید ایک مرتبہ شاہی نمایندہ کی حیثیت سے یمن گئے اور وہاں حکمرانوں کی مدح میں اشعار کہے تھے، چنانچہ علی بن حاتم ہمدانی کی توصیف میں یہ اشعار تھے:-

لئن اجدبت ارض الصعيد واقحطوا — فلست انال القحط في ارض قحطان

اگر سرزمین مصر اور وہاں کے لوگ قحط میں مبتلا ہوگئے تو مجھے یہاں قحطان کی سرزمین میں قحط کی پروا نہیں ہے

ومن كفلت لي مارب بمآربي — فلست على اسوان يوماً باسوان

جب سے آپ نے میری ضروریات کی کفالت کر لی، مجھے ایک دن بھی اسوان کا افسوس نہیں ہوا،

وان جهلت حقي زعانف خندف — فقد عرفت فضلي غطارف همدان

اگر میری قدر و منزلت کو حقیر و معمولی لوگ نہ پہچان سکے تو میرے فضل و کمال کو ہمدان کے بہادروں نے پہچانا ہے

قاضی رشید کے یہی اشعار اُن کی موت کا سبب ہے،

فحسد ہ الداعی فی عدن علے	عدن میں مقیم فاطمی داعی نے ان پر حسد کیا اور
ذالک لکتب بالابیات الی صاحب	اشعار والی مصر کے پاس لکھ بھیجے، جو اسکی برہمی
مصر فکانت سبب الغضب	کا سبب ہے اُس نے ان کو گرفتار کرکے
علیہ فامسکہ وانفذہ الیھم	مصریوں کے پاس بھیج دیا، اور جو کچھ ان کے
مقید آمجرداً واخذ جمیع	پاس تھا سب چھین لیا، قاضی رشید ایک
موجودہ فاقام بالیمن مدۃ ثم رجع	مدت تک یمن میں مقیم رہے، پھر وہ گرفتار
الی مصر فقتلہ شاور کما ذکرناہ	کرکے واپس ہوئے اور شاور نے ان کو قتل کرا دیا

ابو شجاع شاور بن مجیر بن نزار مصر کا وزیر تھا، اس نے صلاح الدین ایوبی کے چچا اسد الدین شیرکوہ سے مقابلہ کیا، جس کے نتیجہ میں ۵۶۴ھ میں مارا گیا، اور اسد الدین شیرکوہ وزیر ہوا، شاور کے قتل کے بعد مصر میں سنت کا قیام ہوا، اور ایک مدت کے بعد بنو عباس کا خطبہ پڑھا گیا، شاور فاطمی شیعہ تھا، اس لئے قاضی رشید اس کے مقابلہ میں اسد الدین شیرکوہ کے طرفدار تھے، اس لئے اُن کے قتل کا ایک سبب یہ بھی تھا، اسد الدین شیرکوہ بڑا نیک نفس تھا، اُس نے بڑے دینی کارنامے انجام دیئے، اس کی موت کے ایک مدت کے بعد اسکی وصیت کے مطابق اس نیک بخت کی لاش قاہرہ سے مدینہ منورہ لیجا کر دفن کی گئی، اسے مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا عشق تھا،

ان تصریحات سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:-

۱- قاضی رشید پانچویں صدی ہجری میں نہیں تھے، بلکہ اُن کی وفات اُن کے دو ثقہ اور معاصر تذکرہ نگاروں کی تصریح کے مطابق محرم ۵۶۳ھ میں ہوئی، اور وہ چھٹی صدی میں تھے،

۲- خراسان میں فاطمیوں کے مرکزی شہر کرمان سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، نہ وہ کبھی

کرمان آئے بلکہ مصر کے شہر اُسوان کے رہنے والے تھے، جو اس زمانہ میں معمولی شہر تھا، جو آج کل اسوان بند کی وجہ سے عالمی شہرت رکھتا ہے،

۳- ان کی شیعیت کے بارے میں اُن کے معاصر تذکرہ نگاروں نے کوئی تصریح نہیں کی ہے، بلکہ اُن کی تحریروں اور اسد الدین شیرکوہ کی طرف قاضی رشید کے میلان سے جس کی پاداش میں وہ قتل کئے گئے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ سُنی تھے، اگر وہ شیعہ ہوتے، تو حافظ حدیث سلفی ضرور ظاہر کرتے، یا اُس کی طرف اشارہ کرتے،

۴- مہذب بن زبیر قاضی رشید بن زبیر کے حقیقی بھائی ہیں، اور مہذب کا لفظ قاضی رشید کی صفت نہیں ہے،

۵- اب جب کہ قاضی رشید کا تذکرہ اُن کے دو معاصر ثقہ راویوں کے ذریعہ مل گیا، اور ان کی تصریح سے معلوم ہوگیا کہ وہ محرم ۵۶۳ھ میں فوت ہوئے، تو محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے کتاب الذخائر کی عبارتوں سے اُن کا زمانہ جو قیاس کیا تھا، وہ صحیح ثابت نہیں رہا۔ مثلاً:-

اھدی میخائیل سنۃ ۴۴۴ھ مع رسول لہ ھدایا جلیلۃ شاھد تجمیعھا بتنیس"

میں ۴۴۴ھ قاضی رشید کے ان ہدایا کو دیکھنے کی تاریخ نہیں ہے، بلکہ میخائیل کے ہدایا بھیجنے کی تاریخ ہے، اسی طرح اخبرنی خطیر الملک عند ورودہ الی تنیس من الشام فی ذیقعدہ سنۃ ۴۶۲ھ ان قبال الدولۃ علی بن مجاھد الخ میں ۴۶۲ھ خطیر الملک کے تنیس میں آنے کی تاریخ ہے، قاضی رشید نے اقعہ بیان کرنے کی تاریخ نہیں ہے، پھر یہ تاریخ بھی محل نظر ہے، کیونکہ یہ واقعہ قاضی رشید کے انتقال سے تقریباً ننانوے سال پہلے کا ہے، اس وقت قاضی رشید کا وجود بھی شاید نہ رہا ہو، ہو سکتا ہے، کہ سنہ کی تعیین کتاب میں غلط طریقہ سے ہوگئی ہو، یا بعد میں نقل کی غلطی ہو،

اھدی الامیر ناصر الدولہ ابو علی الحسن بن حمدان فی سنۃ ۵۶۳ الی ارمانوس

ممالک الروم المعروف بدیوجانس هدیة الخ میں یعنی ۴۶۳ھ ناصر الدولہ کے ہدیہ بھیجنے کی تاریخ ہے،

وحدثنی ابو الفضل ابراهیم بن علی المکف طابی بدمیاط عند قدومه من قسطنطنیة فی شهور سنة ۴۶۳ھ انه رای علی ارمانوس دیوجانس الخ میں ۴۶۳ھ ابو الفضل ابراہیم کے قسطنطنیہ سے دمیاط آنے کی تاریخ ہے، قاضی رشید سے واقعہ بیان کرنے کی تاریخ نہیں ہے۔

واعلمنی من له خبرة بما فی خزانة البنود ان مبلغ ما کان فیها ...... من وقت دخول القائد جوهر وبناء القصر من سنة ۳۵۸ھ الی هذا الوقت انه ازید عن مائة سنة

سے کتاب الذخائر والتحف کا سنہ تالیف تقریباً ۴۶۳ھ ثابت نہیں ہوتا، یہ درست ہے کہ کتاب میں اس کے بعد کے واقعات نہیں ملے"،

اس تحریر سے محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب جیسے محقق پر اعتراض کرنا یا ان کی غلطی نکالنا مقصود نہیں ہے، ڈاکٹر صاحب یورپ میں رہ کر اسلام اور علوم اسلام کی جو بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں اور فرانس میں بیٹھکر نہایت خاموشی سے جو کام کر رہے ہیں وہ تحسین وستایش سے مستغنی ہے، ان کے کارنامے دیکھکر جی چاہتا ہے کہ ان کی خدمت میں رہ کر خوشہ چینی کی جائے، اس لیے اس تحریر کا مقصد محض ایک علمی تحقیق ہے۔

ادبی نقوش

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اڈیٹر معارف کے ادبی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ جسکو ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ نے نہایت اہتمام اور دیدہ زیب کتابت وطباعت کے ساتھ شائع کیا ہے، اس میں دو مضمون یعنی "اردو شاعری میں ہندو کلچر اور ہندوستان کے طبعی وجغرافی اثرات" اور "اردو زبان کی لسانی علمی وتمدنی اہمیت" کے علاوہ جو ادبی سے زیادہ علمی ہیں موجودہ دور کے مشاہیر شعراء کے دواوین مثلاً وادی ایمن جناب مجذوب، حسرت غوری، شعلۂ طور جناب جگر مرادآبادی، ریاض رضوان جناب ریاض خیرآبادی، سرود زندگی جناب اصغر گونڈوی وغیرہ پر مضامین اور تبصرے ہیں۔ قیمت مجلد پانچ روپے۔

پتہ: منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

آثار علمیہ

مکاتیب مولانا سید سلیمان ندوی رح

بنام

مولوی ابو الکمال سید عبد الحکیم صاحب مرحوم دیسنوی

(۳)

اعظم گڈھ

مخدوم ومحترم دام لطفکم السلام علیکم

آپ کے ادھر متعدد کارڈ ملے اور ہر کارڈ کے بعد میں نے جواب دینے کی کوشش کی، لیکن کیوں جواب نہ دے سکا، اب یہ چیز پردۂ راز میں نہیں رہی، کہ میری طبیعت کاہل اور سست اور آرام طلب ہے، اس کو طرح طرح سے بہت ٹالا، کبھی لوگوں سے بیماری وعلالت کا عذر کیا، کبھی سفر کا بہانہ کیا، کبھی کام کی کثرت کا گلہ کیا، مگر آخر کب تک نیا نیا عذر اور نیا نیا بہانہ تراشتا رہوں، کیوں نہ تھک کر اصل واقعہ کا اقرار کر لوں۔

آپ کا ہر کارڈ میری جیب میں اور خاص کاغذات میں رہا کہ جب موقع ملے تو جواب دوں، مگر ندوہ کے جلسہ سے لیکر جوبلی تک سفر کا عذر در پیش رہا، اور جوبلی سے لیکر اب تک علالت کا عذر رہا، پہلے تو لرزہ بخار کی شکایت چند روز رہی، اب ایک عشرہ سے بیٹھنے کی جگہ پر زخم نکل آیا تھا، چند رات بڑی تکلیف اٹھائی، زخم بہہ گیا ہے، کل سے اب مرہم لگے گا۔

عزیزی نجیب اشرف کی رفیقۂ حیات کی وفات کی خبر آپ ہی کے کارڈ سے معلوم ہوئی، آپ نے بھی صورتِ علالت نہیں لکھی، غالباً ان کے اسی پرانے مرض ضعف معدہ کا درد ہوگا، خدا مغفرت کرے، برادرم نجیب کے امتحان و ابتلا کا وقت ہے، سب سے قابلِ رحم حالت مجیب کی ہوگی، بے ماں کے بچہ کی پرورش تو بہت نہایت سخت مشکل ہے، امید ہے کہ نجیب اپنے شغل تعلیم کو جاری رکھیں گے، مجھے خبر نہیں کہ ان کا آئندہ کیا خیال ہے، اور کیا قصد ہے، دار المصنفین کا آغوش تو ہر وقت کھلا ہوا ہے،

ندوہ کی تعمیر کا کام شروع ہوگیا، کوئی دس بارہ ہزار روپے میرے اور مولوی مسعود علی صاحب کی کوششوں سے جمع ہوگئے، غرض کل اس وقت اس مد میں ۲۵ ہزار کے قریب ہیں، دار المصنفین میں امسال کل ۲۵ ہزار کی آمدنی ہوئی، اور کل اخراجات کے بعد ۱ ہزار کی توفیر ہوئی،

علی گڑھ کی مشرقی تعلیم کا نصاب بنانا ہے، اس کمیٹی کا ایک ممبر میں بھی بنایا گیا ہوں، ۹ر فروری سے ۱۱ تک وہاں رہنا ہوگا، دیکھئے کیا ہو،

آپ چندہ دینے کو آئیں تو کون دے، "غازی چو توئی رواست کافر بودن" بخوشی تشریف لائیے

آپ رسالہ کوئی میرا چھاپنا چاہتے ہیں، ابھی لڑکوں کو اس کا تجربہ نہیں، مکاتیب یورپ کے مجموعہ پر کم از کم ۵۰۰ صرف آئے گا، اور سالہا سال میں یہ رقم وصول ہو کر منافع کی شکل نکلے گی، ان لوگوں سے یہ کام بن نہ آئے گا، نظر بندان اسلام والا مضمون بخوشی رسالہ کی صورت میں چھاپ دیا جاسکتا ہے، غالباً ۵۰ روپے لاگت آئے، ۲ر فی کاپی قیمت ہوگی، ڈھائی سو ہوں گے، مگر یہ کون بڑی رقم ہوئی، صرف ڈیڑھ سو کا نفع کئی سال کی محنت میں ہوا، آپ غور کر لیجئے، مہربانی کرکے مولوی محمد حنیف صاحب کی حسن المصادر کا ایک نسخہ سہیل کے لئے بھیج دیجئے، قیمت بتائیے تو بھیج دی جائے،

سب خیریت ہے، وہاں بھی سب خیریت ہو، والسلام

سید سلیمان ، ۳۱ر جنوری ۱۹۲۶ء

اعظم گڈھ محترم دام کرمہٗ السلام علیکم

والانامہ ملا، میں آج ۱ر تاریخ کو دس بجے جونپور سے واپس آیا، آج ہی گویا آخری وقت ہے، اس قدر عجلت میں میرا جگہ سے ہٹنا مشکل ہے، اس کو آپ بھی سمجھ سکتے ہیں، سپاسنامہ چند روز ہوئے کہ بھیج چکا ہوں، قصیدہ کے لیے عرض ہے کہ اقبال سہیل آجکل تعطیل میں مکان گئے ہوئے ہیں، اس کا بھی موقع نہیں، مولوی عبد السلام صاحب سے کہا، انھوں نے کہا اس عجلت میں تو ممکن نہیں، میں تو اس عجلت سے بھی خیر کسی طرح آپ کے ان الفاظ "حقوق انجمن و وطن" سے متاثر ہو کر روانہ ہو جاتا، مگر ایک اور مانع قوی درپیش ہے، ۱۴ر کو کلکٹر صاحب[1] (مسلمان) جونپور دار المصنفین دیکھنے کے لیے آتے ہیں، ایسے موقع پر میرا موجود رہنا ضروری ہے، میں سخت کشمکش میں ہوں، مولوی مسعود علی صاحب سے تذکرہ کیا کہ مکان جاؤں تو انھوں نے برہمی ظاہر کی تو پھر اس کارخانہ کو لپیٹ دیجئے، میں اب اس کو تنہا نہیں سنبھال سکتا۔

میں اپنے قصور مجبورانہ کا معترف ہوں اور معافی کا خواستگار۔

مجھکو راجہ صاحب اماداں اور ایس، ڈی، او صاحب بہار سے یوں بھی مناسبت نہیں، اور نہ یہ میرے دائرہ کی چیز ہے، مجھ میں اگر یہ صلاحیت ہوتی کہ ان سب کو اپنا مہمان بنا سکتا تو کرسکتا، اس وقت درماندگی ہے، اور سفید پوشی بلائے جان ہے، اس آبگینہ کو بڑی حفاظت سے سنبھال کر رکھا ہے، آپ بھی سنبھالنے میں مدد دیجئے

یہ کارڈ صرف آپ کے لیے ہے۔

سید سلیمان ، ۱۱ر اکتوبر ۳۶ء

اعظم گڈھ محترم دام کرمہٗ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے دو کارڈوں کا قرضدار ہوں، پچھلا مہینہ زیادہ تر ہلکی ہلکی بیماریوں کی نذر ہوا، رمضان کے دن گذر رہے ہیں، مگر دیسنہ کا لطف میسر نہیں، وہاں کا عجیب نظارہ ہے، فرصت ملے تو رمضان کا مہینہ لازماً دیسنہ میں بسر کروں۔

[1] شیخ مقبول حسین صاحب قدوائی مرحوم

خطبات مونگیر کی مدح وستایش کی تقریب سے آپ نے پورا سلسلۂ خطبات سلیمانی قائم کردیا،

حمایت اسلام لاہور سے ہر سال تقاضا ہوتا ہے، اور معذرت ہوتی ہے، کل تار آیا ہے، کیا کروں، سمجھ میں نہیں آتا،

پنجاب کا معاملہ اہم ہے، جاؤں تو کیا موضوع سخن ہو،

دار المصنفین کے ارکان دو سو کے قریب ہو گئے، نہیں کوئی شخص دورہ اس کے لیے نہیں کررہا ہے،

ریاست علی صاحب گھر گئے تھے، وہ گیا اور پٹنہ بھی ہوتے آئے،

نقش سلیمانی یوں ہی پڑی ہوئی ہے، محمد علی صاحب سے کھٹ پٹ ہوگئی ہے، اور ان کے دیکھے بغیر اسکو نہیں چھپواؤں گا، ڈاکٹر عظیم الدین صاحب میرے خط کا کبھی جواب دیتے ہیں؟ ان کو کیا خط لکھوں؟

بہرحال آپ کی فرمایش کی تعمیل کروں گا،

(۱۰ / مارچ ۳۶ء)

اعظم گڈھ ۔۔۔ عم محترم ۔۔۔ دام کرمہٗ ۔۔۔ السلام علیکم

آپ کی یاد آوری کا شکریہ، آجکل بیحد مصروف ہوں، مدراس کی مجلس العلماء کی صدارت منظور کرلی ہے، آتا ۱۹ کو اجلاس ہے، خدا خدا کرکے ایڈریس لکھ گیا، اور آج چھپ گیا، ۱۵ / کو مدراس پہنچنا ہے، عزیزم نواب سلمہ کی خواہش ہے کہ میں ان کو اپنے ہی ساتھ بنگلور لیتا جاؤں، مگر یہ ٹیڑھا سفر پریشان کن ہے،

سیرۃ جلد چہارم کا حصۂ عقائد بحمد اللہ ختم ہوگیا،

جناب والا! آپ سے تمام راز اس لیے کہے جاتے ہیں کہ ان سے "بیجا" فائدہ اٹھائیں، قبرستان کے چندہ کی رقم کس حساب سے رکھی گئی ہے، دو سو البتہ پاتا ہوں، کتابوں کا ٹرتا یوں ہی سا ہے، پرانی کتاب بکی، اس سے نئی کتاب چھپی، اس سے خاکسار کو کوئی مالی فائدہ ۔ ؎ / ماہوار کا بھی نہیں ہوتا، آخر ستمبر یا اول اکتوبر تک سفر سے واپسی ہوگی، سفر آج یا کل ہوگا۔

سید سلیمان، ۸ / ستمبر ۳۶ء

اعظم گڈھ ۔۔۔ محترم ۔۔۔ دام لطفہٗ ۔۔۔ وعلیکم السلام

آپ کا کارڈ لکھنؤ میں ملا تھا، مگر وہاں کے ابر و باد اور بارش نے اس طرح جکڑ رکھا کہ جواب کی ہمت نہ ہوئی، پرسوں شب کو واپس آیا ہوں، ابھی تک ابر نے ساتھ نہیں چھوڑا ہے،

میرا مقصد خطبات کے حساب پوچھنے کا یہی تھا کہ آپ لوگوں سے بقایا وصول کریں، تاکہ وہ نذر تغافل نہ ہو جائے، اس لیے آپ باقی داروں کو تقاضے کے خطوط لکھیے۔

ارکان دار المصنفین کے ناموں اور چندوں کی تفصیل معارف میں کیوں چھپتی، یہ کوئی قومی چندہ نہ تھا، کاروباری تجارتی معاملہ تھا، امسال کے حسابات اور روداد میں اس کا بھی حساب شامل دوسرے حسابات کے درج ہے، چھپے تو آپ کو ایک کاپی بھیجدوں، امسال ۵۰ ہزار کا آمد و خرچ ہے،

اب سیرۃ کا دوسرا باب عبادات شروع کرتا ہوں، عقائد کا باب ختم ہوگیا، یہ باب دو سو صفحوں میں ہے، سیرۃ کا یہ حصہ پورا ہو جائے تو سر سے ایک بڑا بوجھ اترے، روزانہ طبیعت پر افسردگی غالب ہوتی جاتی ہے، اور کچھ نہ کرنے پر افسوس، اقتدبس اتی ہوس،

رمضان کا قصد ہے، دیکھیے پورا ہو، ابھی تک حیدرآباد کا معاملہ وسط منزل میں ہے، دار الاقامہ کی تکمیل شاید اس سال ہو جائے، بڑے سست لوگوں سے پالا پڑا ہے۔ ۔۔۔ والسلام

سید سلیمان، ۸ / فروری ۳۸ء

اعظم گڈھ ۔۔۔ محترم ۔۔۔ دامت مکارمکم ۔۔۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کارڈ شرف افزا ہوا، پلاؤ مبارک! چاند کا قران السعدین مبارک، مگر اسی طرح چپ چپاتے اور اتفاقی، اور مختصر اعلان مناسب نہ تھا، بہرحال اللہ مبارک کرے، ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں تہنیت پیش کر دیجیے۔

جامعہ ملیہ اوپر سے تو بہت پرشور رہے، اس کے کارکن نہایت مخلص، باہمت اور غیر معمولی

قربانی و ایثار کے لوگ ہیں، مگر افسوس ہے کہ قوم نے ان کی قدر نہ کی، حکیم صاحب کی موت بھی اس کی زندگی
کا سہارا نہ بن سکی، یونیورسٹی کے تخیل سے گھٹ کر وہ کالج تھا اب کالج سے بھی گھٹا کر اس کو اسکول
بنایا جارہا ہے، گذشتہ جد وجہد اور حکیم صاحب مرحوم کی یادگار کی کوشش بھی اس کو ۱۵ ہزار سے زیادہ اب تک
نہ دلا سکی،

یکم اگست سے اس کے کالج کے چند اساتذہ ہٹا دیے جائیں گے، اور صرف اسکول کا اسٹاف رہ جائیگا
اسکول کا آمد و خرچ تقریباً برابر رہے گا، کالج کا بڑا بار تھا۔

اسکول کی تعلیم چھ برس مڈل اور چار برس میٹرک ہے جس میں اردو، قرآن، اردو ادب، معلومات عامہ،
جغرافیہ، حساب، تاریخ، انگریزی، کچھ عربی اور دینیات، ڈرائنگ اور تاریخ اسلام کی تعلیم ہے، عـه
اجرت خوراک اور صرف مختلف فیسیں ہیں، کل عـه اور بالائی ناشتہ وغیرہ کے اخراجات الگ ہیں، میں
سہیل کو عـه ماہوار دیتا ہوں،

سید انصاری صاحب دیکھ بھال نہیں کرتے، ان کے اسکول ٹیوٹر ارشاد الحق صاحب ہیں،
ان کو لکھ دوں گا، ایک آدھ برس وہاں کا تجربہ کر لیجیے، سہیل[۵] نے تو وہاں کچھ ترقی نہ کی، اگر حساب اور
انگریزی مرتضیٰ وغیرہ کی اچھی ہے تو شاید وہاں مڈل کے چوتھے درجہ میں لیے جائیں، سہیل پچھلے سال تیسرے
میں تھے، اب شاید چوتھے میں جائیں، امتحان باقی ہے۔

دو بھائی ایک ساتھ بھیجے جائیں تو شاید فیس میں وہ کچھ کفایت کر دیتے ہیں، قواعد کی ایک کاپی
آپ منگوا لیجیے، اور نصاب بھی دیکھ لیجیے۔

والسلام

سید سلیمان، ۲۰ جولائی ۲۸ء

اعظم گڈھ

جناب والا

السلام علیکم

خط ملا، میں دو تین دن سے سخت دوران سر میں مبتلا تھا، آج ایسا ہے کہ لیٹے لیٹے خط لکھ سکوں

[۵] سید صاحب کے بڑے صاحبزادے۔

میں چاہتا تھا کہ ۲۰ کو علی گڑھ یونیورسٹی کے کنووکیشن میں شریک ہوں، مگر اچانک بیماری کے باعث سفر ملتوی رہا،
ڈاکٹر ذاکر صاحب کا سخت اصرار و تقاضا ہے کہ ایک ہفتہ میں جامعہ ملیہ آکر رہوں، پھر جب سے میں علی گڑھ یونیورسٹی
کورٹ کا ممبر ہوا ہوں شریک نہ ہوا ہوں، ۹ فروری کو اہم جلسہ ہے، ارادہ یہ ہے کہ پہلی کو دہلی جاؤں،
اور ۹ کو علی گڑھ اور ۱۱ تک اعظم گڈھ واپس آجاؤں، ۲۰ سے رمضان ہے، دینہ آنا شاید امسال ملتوی رہے،
یہاں سے حافظ و قاری کا انتظام نہیں ہو سکتا، اور نہ یہاں سے کوئی جائے گا کہ یہاں کوئی نہیں ہے۔

آج میرے دوران سر میں افاقہ ہے، مگر ضعف بہت ہو گیا ہے، کثرت کار میری بیماری ہے۔

والسلام

سید سلیمان، ۲۴ جنوری ۲۹ء

اعظم گڈھ

محترم زاد لطفہٗ

السلام علیکم

دو کارڈ ملے، رمضان گذر رہے ہیں، مگر وطن کا لطف نہیں، آٹھ رکعت کی تراویح یہیں شبلی منزل
میں ہوتی ہے، جس میں سوا دو پارے ڈھائی پارے پڑھے جاتے ہیں۔

متاثر ہونا یقینی ہے، دنیا جلد جلد اپنا سفر طے کر رہی ہے، اب آپ کی طبیعت کا کیا انداز ہے۔

میں نے آپ کو لکھا ہے یا نہیں لکھا ہے کہ ہندوستانی اکیڈمی نے امسال کا لکچرر مجھے بنایا ہے،
اس کی فرمائش کم از کم تین لکچروں کی ہے، مگر میں نے مضمون کی تکمیل کے لیے چھ کر دیے ہیں، رمضان کے
بعد ۲۰ مارچ سے ۳۰ مارچ تک وقت رکھا ہے کہ یہ بالکل آخری تاریخیں ہیں، لکچر تیار نہ تھے، رمضان
کے ایک مہینہ میں سب تیار کرنا ہے، صبح سے لیکر ۲ بجے تک بیٹھا لکھتا ہوں، دوپہر کو لیٹنے کا موقع نہیں، اس محنت و
کوشش سے اب تیسرا لکچر ختم ہو رہا ہے، رمضان تک کہ آج ۱۸ ہے بمشکل ختم ہو سکیں گے، اس لیے میں بجید
مصروف و مشغول ہوں

اک دل کے کس طرح سے بتاؤں ہزار دل

پڈرس کا مختصر مضمون لکھ کر مجیب صاحب کو دیدیا ہے، یہاں شہر کے بعض محلوں میں طاعون ہے اور پورے ضلع کا نمبر تو پورے ہندوستان میں اول ہے، اللہ رحم فرمائے۔ والسلام

۱۰ رمضان المبارک ۱۳۴۷ھ م ۲۴ مارچ ۱۹۲۹ء

اعظم گڈھ

محترم مجل اللہ شفاکم وعلیکم السلام

آپ کا کارڈ ملا تھا، لیکن مجھے مجبوراً اس رمضان میں ایک تار پر لکھنؤ جانا پڑا، ندوہ کا اہم معاملہ تھا، مولانا شروانی بھی آئے تھے، وہاں دن بھر رہ کر واپس آیا کہ اسی دن شام کو مولانا اعظم گڈھ آنے والے تھے، ۸ رمضان کو سہ پہر کے وقت وہ پہنچے، اسی وقت ان کو شبلی ہائی اسکول میں ان کو اڈریس دیا جانا تھا، اڈریس اس قدر موثر تھا کہ اکثر لوگ آبدیدہ ہو گئے، اور مولانا شروانی پر یہ اثر پڑا کہ وہ رقت کے باعث جوابی تقریر بھی نہ کر سکے۔

دو دن یہاں رہے، یہاں کی ہر چیز کو دیکھا، ۹ کی شام کو بعد عصر دارالمصنفین کی مسجد کی بنیاد رکھی، رسم انتہائی سادگی سے لیکن پورے اثر کے ساتھ ادا ہوئی، مولانا شروانی معمار اور مولانا حمید الدین صاحب اور دارالعلوم کے مقدس بزرگ محدث مولانا حیدر حسن صاحب مزدور، دعائیں خلوص سے مانگی گئیں، پُراثر منظر تھا، مسجد کی تعمیر کا صرف نواب مزمل اللہ خاں نے اٹھایا ہے، پانچ ہزار کا تخمینہ ہے، دو ہزار وصول ہو گئے، باقی منی میں۔

رمضان کی تراویح دارالمصنفین ہی میں ہوتی ہے،

مولوی مسعود علی صاحب کی جاری کردہ رسم کے مطابق احباب میں ہر روز دعوت افطار ہوتی ہے،

آپ کی مزید خیریت معلوم نہ ہو سکی، مہربانی فرما کر خیریت سے مطلع فرمائیے، عبدالنعیم میاں کو سلام فرما دیجئے۔

سید سلیمان ۱۹ فروری ۱۹۳۰ء

اعظم گڈھ

محترم دام فضلکم

عنایت نامہ کا شکریہ! الحمد للہ خیریت ہے، بچے بیمار پڑتے ہیں اور اچھے ہوتے ہیں، اس صوبہ میں آجکل ہیضہ کی فصل ہے، یہاں بھی دو ایک حادثے ہوئے ہیں، مگر عموم و اشاعت میں شاید دیر ہو اور تم موسم بدل جائے۔

سیرت جلد چہارم کا مقدمہ لکھ رہا ہوں، جس میں نبوت کی حقیقت اور اس کے خواص پر مفصل بحث ہوگی، اور خاص طور سے انبیاء کی عصمت اور ان کی وحی و الہام پر تحقیق ہوگی، آدھی بحث تمام ہو چکی ہے، یہ پوری ہو جائے تو کتابت شروع ہو، اس مقدمہ کا ایک ٹکڑا معارف میں دے رہا ہوں،

میں نے حکیم محمدی صاحب مرحوم کا ایک مختصر رسالہ فارسی (۹۰ صفحے) سلسلۂ اولیاء کے حالات میں چھپوایا ہے، اس پر ساٹھ ستر روپئے خرچ آئے ہیں، یہ کیونکر نکلے، ۸ر فی نسخہ قیمت ہے، صرف ۲۰۰ نسخے چھپوائے ہیں، کہیے آپ کے مدرسہ و لائبریری کو کے نسخے لیں، تمام اولاد حکیم محمدی سے عہ سیکڑہ وصول کروں گا تو ساٹھ ہو جائیں گے، یہ نسخہ تو اچھا ہے۔

ہاں آجکل مولف تاریخ گجرات یہیں ہیں، اور اس کی تکمیل میں مصروف ہیں، برادرم عبدالقیوم سلمہٗ کو سلام، سنا ہے میرے زنانہ گھر کی چھت گر رہی ہے۔ ذرا دیکھ کر رپورٹ تو کیجئے۔

والسلام

سید سلیمان ، ۱۳ اگست ۱۹۳۰ء

مکاتیب شبلی اول و دوم

ادبیات

غزل

جناب تسکین قریشی

عزمِ طلب سے پہلے اے دل، پیدا کرو وہ جذبۂ کامل
شور ہو جس کا طوفاں طوفاں ذکر ہو جسکا ساحل ساحل

نام ہے مستی بدمستی کا، کون ہو ایسی بزم میں شامل
ایک ذرا پیمانہ چھلکا، ٹوٹ پڑی محفل کی محفل

علم و عمل کی یہ کوتاہی، فکر و نظر کی یہ گمراہی!
آج کا انساں توبہ توبہ کتنا ہے انجام سے غافل

جوشِ طلب میں ہمسفروں کی ہوگی تمنا جنگجو ہوگی
ہم تو ہیں لیکن اس کے قائل اپنی راہیں اپنی منزل

شغلِ جنوں اور صحرا صحرا کس نے دیکھا کس نے جانا
بات تو جب ہے ذکر ہو تیرا گلشن گلشن، محفل محفل

جو تو ہی ہے قافلہ سازی خیر ہو یارب شرشِ چمن کی
اور پھر ایسا قافلہ جسمیں سب کے سب ہوں رہبرِ منزل

جب سے وہ دامن چھوٹ گیا ہے دل کچھ ایسا ٹوٹ گیا ہے
اشک ہیں لیکن خشک ہیں آنکھیں غم ہے مگر احساس ہے مشکل

ان کی خوشی ہے جو وہ چاہیں راز رکھیں افسانہ بنائیں
آج نگاہِ شوق نے ان سے کہہ تو دیا ہے حالِ غمِ دل

گردشِ جام و شورشِ مستی ساتھ کے پینے والوں تک تھی
لاکھ ہو ذوقِ بادہ پرستی، غیر کی محفل غیر کی محفل

داہر دان کوئے محبت کیوں نہ رکھیں تسکین سے عقیدت
ہے تو وہ اک دیوانہ لیکن اسکی نظر ہے منزل منزل

غزل

چندر پرکاش جوہر بجنوری

رنگ و بہار نکہتِ گل کی خبر لیے
آئی نسیمِ صبح پیامِ سحر لیے

ہر انقلابِ دہر سے تازہ اثر لیے
دنیا سے باخبر ہوں دلِ بے خبر لیے

پیہم نوازشِ غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ
بارِ غمِ حیات بھی ہوں دوش پر لیے

ہر ذرہ ایک منزلِ مقصود بن گیا
گذرا ہوں جس مقام سے ذوقِ سفر لیے

بزمِ خیال سے کوئی ہو کر گذر گیا
ناکامِ دید رہ گئے تابِ نظر لیے

آئینہ دارِ جذبِ وفا ہے خوشا نصیب
پروانہ، گو ہے زندگیِ مختصر لیے

آئے تو بے حجاب ذرا کوئی سامنے
آنکھیں ہیں بیقرار شعورِ نظر لیے

کچھ طائرانِ خاص رہائی کے بعد بھی
بیٹھے رہے قفس میں غمِ بال و پر لیے

جوہر برائے خاطرِ جاناں بصد خلوص
بیٹھا ہوں آج دل کو سرِ رہگذر لیے

غزل

جناب افقر موہانی

ابھی کچھ کچھ خرد کی رہبری ہے
یہ توہینِ مذاقِ عاشقی ہے

نگاہِ مستِ ساقی اٹھ رہی ہے
زمانہ ہے کہ محوِ بیخودی ہے

بنایا جس جگہ بھی آشیانہ
گری ہے اور وہیں بجلی گری ہے

جبینِ شوق ہے اور یار کا در
ہماری بندگی اب بندگی ہے

نہ بدلونگا متاعِ دو جہاں سے
کہ یہ خاکِ آستانِ یار کی ہے

یہ تفریقِ نظر دھوکا ہے، ورنہ
انھیں کی ہر طرف جلوہ گری ہے

مری ہستی نثارِ یار ہو کر
جمالِ یار خود ہی بن گئی ہے

ملی ہے خاک ان کے در کی افقر
یہی تاجِ کلاہِ خسروی ہے

باب التقریظ والانتقاد

طبیہ کالج میگزین علی گڑھ کا شیخ الرئیس نمبر

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے

شیخ بو علی سینا اور "اسلامی فلسفہ" دو مترادف لفظ ہیں اور مشرقی ممالک بالخصوص ہندوستان میں جہاں بھی فلسفہ پڑھنے پڑھانے کا رواج ہے، اس کا سلسلۂ تلمذ بو علی سینا تک ہی پہنچتا ہے، یورپ میں بھی قرونِ وسطیٰ کے اندر عرصہ تک ابن سینا ہی "اسلامی فلسفہ" کا علم بردار سمجھا جاتا رہا، یہاں تک کہ راجر بیکن بھی اپنی بد دماغی کے باوجود اسے "فلاسفہ کا بادشاہ" کہتا تھا، اس لیے مشرق کا یہ عبقری اس بات کا مستحق تھا کہ اس کے شایانِ شان اس کی یادگار منائی جائے، چنانچہ کچھ دن ہوئے طہران میں اس کا ہزار سالہ جشن یادگار بڑی شان سے منایا گیا۔

سال گذشتہ طبیہ کالج علی گڑھ میگزین نے "شیخ الرئیس" نمبر شائع کیا، یہ مقدس فریضہ یونیورسٹیوں کے فضلاء کو انجام دینا تھا، مگر یہ امید پوری نہیں ہوئی، بہر حال طبیہ کالج میگزین نے اس ذمہ داری کا احساس کیا اور اسلامی ثقافت کے اس "عبقری اعظم" کے حالات و آثار پر مقالات کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ اس مجموعہ میں جو دس مضامین ہیں، بعض بڑے مفید اور معلومات افزا ہیں، مگر کہیں کہیں تسامحات بھی ہو گئے ہیں، بعض مقالہ نویسوں نے ایسی بحثیں چھیڑی ہیں جو آیندہ لکھنے والوں کے لیے نئے موضوع فراہم کرتی ہیں،

پہلا مضمون شفاء الملک حکیم عبد اللطیف صاحب کا ہے، جس میں انھوں نے شیخ کی "الادویۃ القلبیۃ"

کو روشناس کرایا ہے، اس موضوع پر حکیم صاحب ہی لکھ سکتے تھے، طبی نوادر کے علاوہ جو امراضِ قلب کے علاج سے متعلق ہیں، اس رسالہ کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ شیخ نے اس میں عضویاتی نفسیات (Physiological Psychology) کے لطائف و دقائق کی بڑی عمدہ توضیح و تبیین کی ہے، اور حکیم صاحب کی رائے میں یہ شیخ کا واحد "ابتکارِ فکر" ہے، حکیم صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ

"تمام کتابوں میں ڈھونڈ ڈالا مگر ایک مسئلہ بھی مجھ کو ایسا نہیں مل سکا جس کو میں یہ سمجھ سکوں کہ یہ شیخ کا ذاتی نظریہ ہے جس کو صرف اس نے اختراع کیا ہو۔"

مگر یہ دونوں باتیں محل نظر ہیں، شیخ کو عبقریت و ابتکارِ فکر سے اس وجہ تہی دامن اور محروم ٹھہرانا ایک "فلسفی طبیب" کے قلم سے مستبعد معلوم ہوتا ہے، اسی طرح جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ شیخ کے پیش رووں نے "عضویاتی نفسیات" کے اسرار و غوامض میں کوئی کلام نہیں کیا اس وقت تک اس کی ابتدا کا شرف کس طرح شیخ کو دیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ بعض تسامحات آنکھوں میں کھٹکتے ہیں، مثلاً صفحہ ۹ سطر ۱۰ پر فرمایا ہے: "یہ فارابی کا ایک رسالہ ہے جس کا نام فصوص ہے"۔ حالانکہ اس رسالہ کا نام "اغراض ما بعد الطبیعہ" ہے [تتمہ صوان الحکمہ للبیہقی صفحہ ۴۲ سطر ۱۰، طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ جلد ثانی صفحہ ۴ سطر ۲، اخبار العلماء باخبار الحکماء ابن القفطی صفحہ ۲۷، سطر ۲]

دوسرا مضمون حکیم کبیر الدین صاحب کا ہے جو "مضمون" نہیں بلکہ مستشرقین کے استخفاف و ازدراء سے ایشیا کے دل میں جو ناسور پڑ گئے ہیں ان کا خونابۂ غم شکوہ سنجی کی شکل میں ٹپک پڑا ہے، "ولابد للمصدور ان ینفث" کاش ان کی شعلہ نوائی نئی نسل کے دلوں کو سوزِ یقین سے گرما دے۔

تیسرا مضمون شیخ کی تفاسیر پر مولانا محمد اویس صاحب نگرامی کا ہے، انھوں نے اپنے انداز میں بہت خوب لکھا ہے، یہ صحیح ہے کہ شیخ نے کتاب اللہ، سنت رسول، آثار صحابہ و تابعین اور لغت عرب کے شواہد کے خلاف آیات قرآنی کی تاویل و توجیہ نوافلاطونی افکار یا اخوان الصفا کی مخصوص فلسفیانہ تعلیمات کی روشنی میں کی ہے، با ایں ہمہ یہ بھی ایک اندازِ فکر ہے، جو شیخ کے پہلے سے چلا آ رہا ہے [غالباً نالمو یہودی کے زمانہ سے]

اور جو بعد میں بھی مروج رہا، بالخصوص متصوفین کے یہاں، اس لیے شیخ کی تفاسیر پر ابن جریر و ابن کثیر یا الاتقان والبرہان کی روشنی میں تنقید نہ ہونی چاہیے بلکہ اس حیثیت سے ہونی چاہیے کہ اس نے "اخوان الصفا" کی تاویلات کی کہاں تک خوشہ چینی کی ہے، نیز بعد کے متصوفین بلکہ متکلمین کے یہاں جو "عرفانی تفسیر" کا رواج پایا جاتا ہے شیخ کے انداز تفسیر سے اس کا کیا تعلق ہے، بالخصوص بعد کی اسماعیلی تفاسیر جیسے تفسیر حکیم ناصر خسرو، مزاج التسنیم وغیرہ اس سے کہاں تک متاثر ہوئی ہیں۔

چوتھا مضمون ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کا ہے جس کا عنوان "بو علی سینا کی جدت وجودت" ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ حکیم عبد اللطیف صاحب نے اپنے مقالہ میں شیخ کے ابتکار فکر سے جو انکار کیا تھا ڈاکٹر صاحب نے اس کا جواب دیا ہوگا مگر مضمون میں عنوان کی پابندی کو زیادہ ملحوظ نہیں رکھا، اصل ماخذ و مصادر سے براہ راست مراجعہ کے بجائے وسائط کے ذریعہ استفادہ کیا گیا ہے، جس سے حقیقت پر افسانہ کا رنگ چڑھ گیا ہے۔

پانچواں مضمون مولانا ضیاء احمد صاحب کا ہے "ابن سینا کا فارسی کلام" اس میں انھوں نے صحت سے "دانش نامۂ علائی" کا "تاریخ بلعمی" سے مقابلہ کیا ہے، حکیم ناصر خسرو کی "زاد المسافرین" کا بھی ذکر آگیا ہے جو "دانش نامہ" کی طرح فلسفہ کی کتاب ہے، اور جو دانش نامہ کے زیادہ عرصہ بعد تصنیف نہیں کی گئی، اس لیے مقابلہ اس سے ہونا چاہیے تھا، اور شاہنامہ کے ان اشعار سے بھی جن میں فلسفیانہ خیالات ہیں موازنہ ضروری تھا۔ اسی طرح ابو یعقوب سجستانی کی کشف المحجوب سے جو اسی موضوع پر شیخ سے پہلے کی کتاب ہے موازنہ ضروری تھا، اس مضمون میں بعض غیر متعلقہ بحثیں ہیں مثلاً

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے (ذات و صفات باری تعالیٰ کی عینیت و غیریت) میں اس کا مسلک صوفیہ کے مسلک سے قریب ہے"۔

اگر اس کا ذکر نہ ہوتا تو اچھا تھا، ترکِ ذکر سے کچھ حرج نہ تھا، ذکر سے ایک نئی بحث کا افتتاح ہوتا ہے کیونکہ

باری تعالیٰ کی ذات و صفات کی عینیت کا قول شیخ نے صوفیہ سے اخذ نہیں کیا ہے، بلکہ خود صوفیہ نے یا تو شیخ کا مسلک اختیار کیا ہے یا اس ماخذ و مصدر سے استفادہ کیا ہے جو خود شیخ کے اس انداز فکر کی اصل ہے۔

چھٹا مضمون محمد اشرف صاحب کا ہے "ابن سینا پر اجمالی نظر"۔ یہ بڑا مبسوط مضمون ہے مگر ایسا خیال ہوتا ہے کہ اصل عربی مصادر کے بجائے انگریزی تراجم کو سامنے رکھ کر یہ مضمون لکھا گیا ہے، جس کی وجہ سے اعلام واماکن میں مضحکہ خیز غلطیاں ہو گئی ہیں، مثلاً ابو ہیان توہدی [ابو حیان توحیدی] ابو عبید گرگانی [جوزجانی] اقلیدس کی ناقلی کو گرگان جانا پڑا [؟؟؟] طارم [طارم] دمجوس (طوس) نیشاپور [؟] بیاورد [ابیورد] کتاب الحلیل والنحل [کتاب الملل والنحل] ابو عبد اللہ ابراہیم عبد اللہ ناقلی [ابو عبد اللہ الحسین بن ابراہیم الطبری الناتلی]۔ جہاں واقعات میں خلا پایا ہے اسے پرواز تخیل سے آباد کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً سامانیوں کے کتب خانہ میں آگ لگ جانے کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"جب سوء اتفاق سے ۱۰۰۰ء میں شاہی کتب خانہ میں آگ لگ گئی تو شیخ نے اپنی غیر معمولی یادداشت سے متعدد کتابیں تیار کر کے ایک حد تک اس نقصان کی تلافی کر دی"۔

"حکیم ارسطو کی مشہور مابعد الطبیعیات پر ابو نصر فارابی کے فلسفیانہ دلائل کی مدد سے شیخ نے عالمانہ حاشیہ لکھے"۔

"علم تصوف میں شیخ نے صوفی اسمٰعیل سے استفادہ کیا" [حالانکہ یہ اسمٰعیل صوفی نہیں بلکہ زاہد تھے اور شیخ نے ان سے فقہ کی تکمیل کی تھی]

"یہیں مشہور زمانہ فقیہ ابو عبید عبد الواحد جوزجانی سے ملاقات ہوئی اور ان کے ایما و اصرار پر شیخ تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے"۔

[حالانکہ ابو عبید یا معصومی وغیرہ کو شیخ صرف اعزازی طور پر "فقیہ" کہتا ہے، ورنہ ابو عبید فلسفی تھا، فقیہ نہیں تھا، نیز ابو عبید کی ملاقات کے کہیں پہلے سے شیخ تصنیف و تالیف کا کام شروع کر چکا تھا اور کئی کتابیں

مثلاً کتاب المجموع (الحکمۃ العروضیہ) کتاب الحاصل والمحصول (بیس جلدوں میں) کتاب البر والاثم
لکھ چکا تھا، ابو عبید کے ایما و اصرار سے کتاب الشفا لکھی تھی۔

"ان کا ایک ملازم بد دیانت تھا اور دوائیں چرایا کرتا تھا۔" [حالانکہ اس نے روپیہ کی چوری
کی تھی، "وکان سبب ذلك خیانتهم فی مال کثیر من خزانته"]

لیکن بایں ہمہ مسامحات مضمون بڑا مبسوط ہے، اور بڑی محنت و جانفشانی سے مرتب کیا گیا ہے
بلکہ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو شیخ پر آیندہ لکھنے والوں کے لیے نیا موضوع فراہم کرتی ہیں، مثلاً شیخ
محمود کی دعوت پر غزنی نہیں گیا، قاضی نور اللہ شوستری نے مقالہ نویس کی روایت کے مطابق اسکی
وجہ شیعہ سنی اختلاف بتائی ہے، مگر خود مقالہ نویس کی رائے میں اس کی وجہ یہ تھی کہ

"سلطان محمود مغلوب الغضب ... تھا اور ..... خود زیور علم و فضل سے آراستہ نہ تھا۔"

ان دونوں رایوں پر محاکمہ بڑا دلچسپ ہوگا بالخصوص جب اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ اس
زمانہ میں اسماعیلی دعاۃ جنوبی مغربی ایشیا میں انقلاب برپا کرنے میں کوشاں تھے، خوارزم (جرجانیہ)
ان کا مرکز اور شیخ اس انقلابی تحریک کا خاموش کارکن تھا،

نواں مضمون حکیم معین الدین کا ہے، "قانون شیخ کی یورپ میں مقبولیت"۔ اس کے شروع میں انھوں نے
ایک سوال قائم کیا ہے۔

"شیخ الرئیس کا قانون فی الطب یورپ میں کس راستہ پہنچا، یہ ایک سوال پیدا ہو رہا ہے۔"

سوال قائم کرنے کے باوجود انھوں نے اس کا تشفی بخش جواب نہیں دیا، عربی سے لاطینی میں ترجمہ کا آغاز
پوپ سلوسٹر دوم کی ترغیب و تشویق سے شروع ہوا، پہلا مشہور مترجم قسطنطین افریقی (المتوفی ۱۰۸۷ء)
تھا جس نے طبی کتابوں سے علی بن العباس المجوسی "کامل الصناعہ" کے نظری حصہ کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔
عملی حصے کا ترجمہ اسکے شاگرد یوحنا نے کیا، مگر قانون کی تصنیف کے بعد کامل الصناعہ کی اہمیت کم ہوگئی، چنانچہ ابن القفطی نے لکھا ہے:

وهو کتاب جلیل وکناش نبیل اشتمل علی علم الطب وعمله حسن الترتیب مال الناس
الیه فی وقته ولزموا درسه الی ان ظهر کتاب القانون لابن سینا۔ فمالوا
الیه وترکوا الملکی بعض الترك۔ والملکی فی العمل ابلغ والقانون فی العلم اثبت"۔

"اس کا اثر یورپ کے طبی مدارس پر بھی پڑا اور اگلی صدی میں مشہور لاطینی مترجم جیرارڈ آف کریمونا
(۱۱۱۴ء۔۱۱۸۷ء) نے قانون کا لاطینی میں ترجمہ کیا، اس طرح قانون یورپ میں پہنچی، اور پھر اتنی مقبول
ہوئی کہ چھ صدیوں تک ٹیکسٹ بک کے طور پر داخل نصاب رہی۔

ابو العلاء ابن زہیر کا قصہ غلط مبحث ہے، رہا اس کا قانون کی تنقیص کرنا تو اس میں بہت کچھ
حریفانہ چشمک کو بھی دخل تھا، وہ اکیلا شخص نہیں ہے جس نے قانون کو تنقیص و تنقید کی نظر سے دیکھا ہو
بلکہ اس کے اور بھی مخالفین و معاندین تھے، مثلاً ابن المنفاخ نے کلیات قانون کے متعلق مقالات کو
"المہملات من الکلیات" کے عنوان سے مدون کیا، جس کا جواب موفق الدین سامری نے لکھا، اسی طرح
موفق الدین عبد اللطیف بغدادی نے امام رازی کی شرح کلیات کا رد لکھا اور ابن الجمیع کے حواشی پر تعقب کیا۔

آخری مضمون اڈیٹر میگزین کا ہے، جس میں شیخ کی تصانیف کو گنایا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ موجودہ کتابوں
کے مخطوطے کہاں کہاں ہیں، اس موضوع پر حال ہی میں ایک مبسوط کتاب طہران سے شائع ہوئی ہے،
اپنے مضمون میں کتاب نمبر (۵۳) کے ضمن میں اڈیٹر صاحب نے فرمایا ہے۔

"(۵۳) الحکمۃ المشرقیہ، ایا صوفیا، نور عثمانیہ اور بوڈلین میں موجود ہے"۔

اسی قسم کا خیال آج سے کوئی ساٹھ سال پہلے علامہ اقبال نے "فلسفہ عجم" میں اظہار فرمایا تھا۔

"شیخ کی تصنیف الحکمۃ المشرقیہ ہنوز موجود ہے اور ہم تک اس کا ایک جزء پہنچا ہے جس میں اس فلسفی نے
فطرت کے اندر عشق کی ہمہ گیر کارفرمائی پر اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں"۔

اسی طرح جناب محمد اشرف خاں صاحب ایم اے نے "ابن سینا پر اجمالی نظر" میں (جس پر تبصرہ اوپر مذکور ہو چکا ہے) لکھا ہے:

"بعض محققین کا خیال ہے کہ شیخ الرئیس فلسفہ میں ارسطو کی کورانہ تقلید کرتے تھے لیکن یہ غلط ہے اسکی تصدیق کے لیے ان کی مشہور تصنیف حکمۃ المشرقیہ کے مطالعہ سے ہوتی ہے جس میں انھوں نے ارسطو کے بعض نظریات سے الگ ہو کر اپنے فلسفیانہ لمحات و کلیات آزادانہ منطقی دلائل سے ثابت کیے ہیں"

لیکن یہ خوش فہمیاں ہیں۔ "الحکمۃ المشرقیہ" آج سے آٹھ سو سال قبل ۵۴۶ھ میں نذر آتش ہو چکی، جب کہ سلطان علاء الدین جہاں سوز نے غزنی میں آگ لگائی تھی،

دا با ایا صوفیا کا مخطوطہ (نمبر ۲۴۰۳- الحکمۃ المشرقیہ) تو اسے کارادی فو (Carra de Vaux) نے خود جا کر دیکھا تھا، مگر معلوم ہوا کہ النجاۃ کی قسم کا ایک رسالہ ہے۔ اسی طرح بوڈلین کے مخطوطہ میں (نمبر ۴ کتب عبریہ فہرست قدیم مرتبہ اوری ۱۸۸۱ء) چار رسالے ہیں، چوتھے کا عنوان ہے "جزء من الطبیعیات من کتاب الفلسفۃ المشرقیہ"۔ لیکن بوزی کا خیال ہے کہ یہ طبیعیات شفا کا جزء ہے اور اسٹینشنیڈر (Steinschneider) اور کوفمن (Kaufmann) کے خیال میں یہ منحول اور جعلی ہے، ایک تیسرا نسخہ اور بتایا جاتا ہے، جس کا ایک مخطوطہ لیڈن میں اور دوسرا برٹش میوزیم میں ہے لیکن یہ تصوف پر ابن سینا کے چند رسائل کا مجموعہ ہے، جسے میہرن (Mehren) نے رسائل .... فی الحکمۃ المشرقیہ "کے عنوان سے ۱۸۹۴ء میں شائع کیا تھا، حالانکہ بقول نلینو جس مخطوطے کی مدد سے یہ چھاپا گیا ہے اس میں اس عنوان کا ادنی تعلق بھی نہیں ہے، خود میہرن نے اسکا فرانسیسی ترجمہ "Traites mystiques d' Avicena" کے نام سے شائع کیا۔

میہرن ہی پر غیر مشروط اعتماد کرکے علامہ اقبال نے فلسفہ عجم میں مذکورۂ بالا ادعا فرمایا۔

بہر حال شیخ کی "الحکمۃ المشرقیہ" آج سوائے اس جزء کے جو منطق میں ہے اور جس کا واحد مخطوطہ دار الکتب المصریہ میں موجود ہے (فہرست کتب الدار جلد ۶ صفحہ ۱۰۳، حکمۃ ۶ م القطعۃ الثالثۃ) جو قاہرہ سے چھپ چکا ہے۔ باقی حصہ اس کتاب کا آج ناپید ہے اور اس کی بازیافت کی تمام امیدیں بظاہر منقطع ہو چکی ہیں۔ اس سلسلہ میں "جمہور علی گڑھ (۲۶ دسمبر ۱۹۵۹ء) میں "شیخ ابو علی سینا علامہ اقبال کے فلسفہ عجم میں" کا مطالعہ مفید ہوگا۔

مطبوعاتِ جدیدہ

ہم نفسان رفتہ۔ از رشید احمد صدیقی، صفحات ۱۷۲، طباعت و کتابت بہتر، قیمت ۶ پتہ:- دار المصنفین اعظم گڈھ۔

"ہم نفسان رفتہ" جناب رشید احمد صاحب صدیقی کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے بعض مخلص احباب اور قابل احترام اکابر کی وفات پر لکھے تھے، اس میں سات اشخاص کا تذکرہ ہے شفیق الرحمن قدوائی، مولانا سید سلیمان ندوی، افضل العلماء ڈاکٹر عبد الحق مرحوم، نواب محمد اسمٰعیل مرحوم، مولانا ابو الکلام آزاد، پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) کنڈن۔

رشید احمد صاحب یوں تو نصف درجن کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں لیکن ان کی تصانیف میں جو مقبولیت گنجہائے گرانمایہ کو ہوئی دوسری کتابوں کو نہیں ہوئی، اسی گنجہائے گرانمایہ کا نقش ثانی، یا تتمہ "ہم نفسان رفتہ" ہے، دونوں کا موضوع اور مقصد ہی نہیں بلکہ قریب قریب انداز تحریر بھی یکساں ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کے علاوہ ان میں سے ہر ایک سے ان کے ذاتی تعلقات تھے، اس لیے انھوں نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ذاتی تاثر اور مشاہدہ ہے، رشید صاحب کی دوسری تصانیف ان کے دماغ کا نتیجہ ہیں، بلکہ گنجہائے گراں مایہ اور ہم نفسانِ رفتہ میں دماغ سے زیادہ ان کی دلی محبت و عقیدت اور عظمت و احترام کا اثر نمایاں ہے، اسی لیے ان کتابوں کے پڑھنے سے دماغی تفریح بھی ہوتی ہے اور دل بھی متاثر ہوتا ہے، رشید صاحب نے ان مرحومین کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ ان کی پوری شخصیت نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، اور خود مصنف کی سیرت، خیالات اور رجحانات کا عکس بھی نظر آجاتا ہے۔

ادبی حیثیت سے بھی یہ مضامین بہت ہی بلند پایہ اور قابل مطالعہ ہیں، ان کے بعض فقرے اور جملے تو ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں،

علی و حسین۔ از قاضی اطہر مبارکپوری، صفحات ۳۳۶، طباعت و کتابت متوسط، پتہ: مکتبہ دائرہ ملیہ، مبارک پور، اعظم گڈھ۔ قیمت ؎

مولانا محمود احمد عباسی کی کتاب "خلافت معاویہ و یزید" کے جواب میں جو کتابیں اور رسالے اور بیشمار مضامین لکھے گئے، ان میں ایک قاضی اطہر مبارک پوری کی کتاب "علی و حسین" بھی ہے، قاضی صاحب نے خلافت معاویہ و یزید پر ہر پہلو سے تنقید کی ہے اور تاریخی مسلمات کی روشنی میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عباسی صاحب نے اپنے دعاوی اور نظریات کو ثابت کرنے کے لیے یا تو تاریخ کی کمزور روایتوں کا سہارا لیا ہے یا ان میں بڑی حد تک کتر بیونت کی ہے، انھوں نے جابجا مصنف کے ترجمہ کی غلطی اور تشریح کا نقص بھی دکھانے کی بھی کوشش کی ہے،

یہ واقعہ ہے کہ صاحب خلافت معاویہ و یزید اگر حضرت علی، حضرت حسین اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہم کے دامان عصمت کو داغدار بنانے کے بجائے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید اور بنو امیہ کی صفائی اور ان پر لگائے ہوئے الزامات کی تاریخی طور پر تردید کرتے تو ان کی یہ سعی بہت زیادہ مسعود ہوتی لیکن انھوں نے حضرت معاویہ، یزید اور بنو امیہ کی صفائی میں مدافعانہ روش اختیار کرنے کے بجائے جارحانہ روش اختیار کر لی جو نہ صرف جذباتی لحاظ سے صحیح نہیں ہے، بلکہ واقعات اور تاریخی حقائق کے لحاظ سے بھی ..... صحیح نہیں ہے۔

مذکورہ کتاب کی تردید میں جتنی کتابیں اور رسالے شائع ہوئے ہیں ان میں قاضی صاحب کی کتاب زیادہ سنجیدہ اور تحقیقی ہے، لیکن غالباً خلافت معاویہ و یزید کے اثر سے ان کی تحریر میں بھی کہیں کہیں بے اعتدالی آگئی ہے، کتاب مجموعی حیثیت سے محمود احمد عباسی کا شافی جواب ہے۔

نیا طوفان اور اسکا مقابلہ۔ از جناب مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی، ناشر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، دار العلوم ندوۃ العلماء،

مولانا ابو الحسن علی صاحب ندوی نے کچھ دن پہلے "ردۃ جدیدۃ" اور "دعوۃ جدیدۃ" کے عنوان سے عربی میں ایک مضمون دنیائے اسلام کے معروف رسالہ المسلمون میں لکھا تھا، اس مضمون کا ترجمہ مولوی عتیق الرحمٰن سنبھلی نے کیا تھا، اسی ترجمہ کو مجلس تحقیقات و نشریات اسلام نے ایک رسالہ کی شکل میں شائع کر دیا ہے،

مغربی افکار و نظریات اور مادی فلسفۂ حیات کے اثر سے عام طور پر جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں خاص طور سے عرب ملکوں میں ہر طرف ایک فکری انتشار اور ذہنی ارتداد پھیلا ہوا ہے، جس سے ان کے دین و ایمان کی ساری بنیادیں ہل گئی ہیں، اور اسلام کے بارے میں وہ عام طور پر محسوس و غیر محسوس طور پر ریب و شک میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں،

مولانا ابو الحسن علی صاحب ندوی نے اس کے ذریعہ مسلمانوں کو یہ دعوت دی ہے کہ جس طرح ہر عہد کے نئے نئے فتنوں کے مقابلہ کے لیے خدا کے کچھ صاحب عزیمت بندے اٹھ کھڑے ہوا کیے ہیں، اسی طرح اس عالمگیر فتنہ بلکہ طوفان کے مقابلہ کے لیے بھی کچھ ایسے مردان کار کی ضرورت ہے جو فکر و عمل کے ہر محاذ پر نہ صرف اس کا مقابلہ کر سکیں بلکہ آیندہ نسل کو اس طوفان کی زد میں آنے سے بچا سکیں۔ مولانا نے اسی مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی داغ بیل ڈالی ہے، جس نے تھوڑی سی مدت میں کئی قابل قدر کتابیں شائع کی ہیں، مولانا کی اس پکار پر ہر صاحب ایمان کو لبیک کہنی چاہیے، کیونکہ وقت کی سب سے اہم پکار ہے۔ یہ اہم اور ضروری فریضہ بعض دوسری دینی جماعتیں بھی انجام دے رہی ہیں، یہ ممکن ہے کہ ان کا طریقہ کار مولانا کے طریقۂ کار سے مختلف ہو، لیکن ان کے خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ رسالہ ہر مسلمان کو مطالعہ کرنا چاہیے، ترجمہ میں متن کی تمام ظاہری و معنوی خوبیاں موجود ہیں۔

الرسالۃ المستطرفہ۔ محمد بن جعفر الکتانی، صفحات ۲۱۰، ٹائپ عمدہ، ناشر نور محمد، اصح المطابع، آرام باغ، کراچی۔

محمد بن جعفر الکتانی اس صدی کے ممتاز عالم اور فاس (مراکش) کے رہنے والے ہیں، اس سے پہلے ان کی متعدد کتابیں چھپ کر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہیں، ان ہی میں الرسالۃ المستطرفہ بھی ہے، یہ رسالہ پہلی بار ۱۳۳۲ھ میں بیروت سے شائع ہوا تھا، اب پھر اسے نور محمد مالک اصح المطابع نے دوبارہ اہتمام سے شائع کیا ہے۔

یہ رسالہ علوم حدیث سے متعلق ہے، اس میں سب سے پہلے حدیث کی متداول اور معروف کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے، پھر ائمہ اربعہ اور ان کے تلامذہ کی کتب حدیث کی تفصیل ہے، پھر حدیث سے متعلق اب تک جو لٹریچر تیار ہوا ہے ان سب کا فن وار اجمالی تعارف کرایا گیا ہے، اس میں بعض ایسی نادر کتابوں کا ذکر بھی ہے جن کا علم کم لوگوں کو ہوگا اور ان کے سامنے آجانے کے بعد تاریخ علم حدیث کے بعض اہم گوشے سامنے آجائیں گے، فن حدیث سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اس رسالہ کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

اگر ناشر صاحب نے کسی صاحب علم سے مصنف کے حالات اور کتاب کی خصوصیات پر عربی میں مختصر سا تعارف نامہ بھی لکھوا دیا ہوتا تو اس کی افادیت اور بڑھ جاتی۔

رکعات تراویح۔ از مولانا حبیب الرحمن الاعظمی، ضخامت ۳۲ صفحے، قیمت ۸ر، پتہ: مدرسہ مفتاح العلوم مئو، اعظم گڈھ۔

"رکعات تراویح" مولانا حبیب الرحمن صاحب کا ایک مفید کلامی رسالہ ہے، اس میں انھوں نے بیس رکعات تراویح کی سنیت اور آٹھ رکعت کے نماز تراویح نہ ہونے کے دلائل فراہم کیے ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ اپنے مدعا کے اثبات میں مولانا نے پوری داد تحقیق دی ہے، یہ اس رسالہ کا دوسرا اڈیشن ہے، جس کا حجم پہلے اڈیشن کے مقابلہ میں دوگنا ہوگیا ہے۔

م۔ ج